ماہنامہ

ون اردو

فروری ۲۰۱۱ء، ربیع الاوّل ۱۴۳۲ھ

شاعری

سائنس و ٹیکنالوجی

اُردو ادب

عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

میں گناہ گار و خطا کار مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یار
مہربان مجھ پہ ہر آن ہے سبحان اللہ

گوشہ خواتین

خوبصورت لوگوں کی سرزمین

www.oneurdu.com

اس شمارے میں

ابتدائی صفحات

عرضِ حال — یاز غل — 1
آیتِ مبارکہ، حدیثِ نبوی ﷺ — سمارا — 2
حمدِ باری تعالیٰ، نعتِ رسول ﷺ — فرید ندوی — 3

تبصرہ جات

تبصرہ — ضحیٰ — 4
تبصرہ — آمنہ احمد — 4

اسلام

حجاب — سمیر — 5
اسلام کی طرف لوگوں کو بلانا — احمد غزنوی — 7
لباس اور تکبر — سمیر — 9

اُردو ادب

ناول، افسانے، انشائیے

جسمانی غلامی اور ذہنی غلامی — رضوان — 10
بنیاد پرست ترجمہ — ندیم اختر — 12
زندگی کے موڑ پر — کائنات بشیر — 16
چیخ — رافعہ خان — 18
سوچ کا گرداب — کشتاج مرزا — 19
کوما — آمنہ احمد — 20

سفر نامہ

سرزمینِ مصر — دُرِ نایاب — 21

مزاحیہ تحریر

پاگل خانہ برائے فروخت — کشتاج مرزا — 25

اُردو شاعری

نظم

شیشے کے اس پل کے پار — جوئیاں — 27
میں شاد کیوں نہیں ہوں — ندا سلیمان — 27
میں اور اب نہیں جیوں گی — رافعہ خان — 28

غزلیات

غزل — ندا سلیمان — 29
غزل — فرید ندوی — 29
غزل — حسن آتش چاپدانوی — 29

اس ماہ کے شاعر

ماجد صدیقی کی غزلیات — ماجد صدیقی — 30

مزاحیہ شاعری

انور مسعود کی شاعری سے انتخاب — عمران نیئر خان — 31
شادی شدہ کی نصیحت — سمیر — 31

گوشۂ خواتین

گرل چکن ان ٹماٹو سوس — وجیہہ — 32
چکن منچورین — سعدیہ محمد — 32
کائنات کے کچن ٹوٹکے — کائنات بشیر — 33
بیوٹی ٹپس — ابیل — 33

سائنس و آئی ٹی، انٹرٹینمنٹ و اسپورٹس

ویب براؤزرز کا تقابلی جائزہ — ٹرومین — 34
شہنشاہِ جذبات — دلپسند سیال — 41
مجھے ہے حکمِ اذاں — مون — 49
فلمی کہکشاں — کائنات بشیر — 50
سوال آپ کے جواب ہمارے — ادارہ — 51
بل گیٹس — دلپسند سیال — 52
آسٹریلیا آسٹریلیا ہے — عبداللہ — 56

سرپرستِ اعلیٰ: سائٹ ایڈمن

مدیرِ اعلیٰ: یاز غل

معاون مدیران: عمران نیئر خان، سمارا، صدیقی، نوما، امان، ٹرومین

میگزین ڈیزائنرز: حرفِ دُعا، ھوشربا، فائزہ صدف، اسمائلنگ آئیز، ٹرومین

کوآرڈی نیشن منیجر: سعدیہ محمد

اکاؤنٹ منیجر: محسنہ

عرضِ حال

معزز قارئین! السلام علیکم

اگلے شمارے کے ساتھ ایک بار پھر حاضرِ خدمت ہیں۔

ربیع الاول کا مہینہ چل رہا ہے جس کا تقدس اور حرمت اس ہستی کی وجہ سے فزوں تر ہو جاتی ہے کہ جس کے واسطے اس ساری کائنات کو بنایا گیا۔ رسولِ کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک کو سارے جہاں کے لئے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا گیا۔ بلاشبہ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے ہیں۔

ضرورت اس چیز کی ہے کہ رسول کریم کی تمام تر تعلیمات سے اپنی زندگیوں کو منور کیا جائے۔ درج ذیل ایک حدیث پہ ہی عمل کر لیا جائے تو ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل سرے سے ہی ختم ہو جائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے مسلمان محفوظ رہیں"۔

گزشتہ کچھ ماہ کے دنیا بھر کے حالات پہ نظر دوڑائی جائے تو فیض احمد فیض کے یہ اشعار ذہن میں گونجنے لگتے ہیں:۔

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے

جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں

جو دریا جُھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

عوامی جوش و جذبے کا جو حالیہ سیلاب سرزمینِ تیونس سے اٹھا، اسی کے اثرات سے مصر میں بھی خلقِ خدا نے تخت گرا دیئے اور تاج اچھال دیئے ہیں۔ یہی سیلاب اب یمن، بحرین، اردن اور دیگر بہت سے ممالک میں اپنی حشر سامانی کے ساتھ زور پکڑ رہا ہے۔ نجانے کس گھڑی اس کی دستک ہمارے ایوانوں کے باہر بھی سنائی دینے لگے۔

ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

فروری میں ہی دنیائے کرکٹ کا سب سے بڑا معرکہ یعنی آئی سی سی ورلڈ کپ بھی شروع ہونے جا رہا ہے۔ ہر ٹیم بھرپور تیاری اور جوش و جذبے کے ساتھ میدان میں اتر رہی ہے۔ فتح کا تاج کس کے سر سجے گا، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ تاہم ہماری تمام دعائیں اور نیک تمنائیں قومی کرکٹ ٹیم کے ساتھ ہیں۔

اور آخر میں ایک چھوٹی سی بات کہ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔

والسلام

یاز غل

مدیرِ اعلیٰ

ماہنامہ ون اردو

آیتِ مبارکہ

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ (40:51) (المؤمن:51)

ترجمہ: "بے شک ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور قیامت کے دن بھی مدد کریں گے جس دن اعمال لکھنے والے فرشتے گواہی دینے کھڑے ہوں گے۔"

حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

"حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ چار چیزیں وہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کبھی نہیں چھوڑتے تھے:

i۔ عاشورہ کا روزہ

ii۔ عشرہ ذی الحجہ یعنی یکم ذی الحجہ سے یوم عرفہ نویں ذی الحجہ تک کے روزے

iii۔ ہر مہینے کے تین روزے اور

iv۔ قبل فجر کی دو رکعتیں۔" (سنن نسائی۔ معارف الحدیث)

(مراسلہ: سمارا)

حمدِ باری تعالی

جس کا ہر چیز پہ قبضہ ہو گا
کون ہمسر بھلا اُس کا ہو گا

دل کا ہر سمت جو قبلہ ہو گا
سجدہ اُس دل کا نہ سجدہ ہو گا

دل میں جب اُس کا بسیرا ہو گا
دل نہیں، عرشِ معلٰی ہو گا

جان دے کر بھی جو تو مل جائے
تو بھی سودا بڑا سستا ہو گا

واہ! رنگینیٔ صوت و صورت
کتنے سانچوں میں تراشا ہو گا

طور جب ہو گیا ریزہ ریزہ
کس کو پھر ذوقِ نظارا ہو گا؟

پوچھتا رہتا ہے شوقِ دیدار
کب وفا وعدۂ فردا ہو گا؟

حسنِ فانی ہے حسیں جب اتنا
خالقِ حسن وہ کیسا ہو گا؟

سیلِ غم میں جو سکوں دیتا ہے
وہ کہیں پاس ہی رہتا ہو گا

ڈال دو نامِ خدا پر کشتی
غرق ہر گز نہ سفینہ ہو گا

بیکراں اس کی ہے شانِ عظمت
ہم سے اُس کا نہ احاطہ ہو گا

ہم کو جس حال میں رکھے مولیٰ
شکر ہی ہم سے ہمیشہ ہو گا

تو فرید اس کی اطاعت کر لے
تیرا خادم یہ زمانہ ہو گا

(فرید ندوی)

نعتِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم

جس دل میں حق پہ مرنے کا جذبہ نہیں کوئی
اس کا نبی کے دین میں حصہ نہیں کوئی

روشن نہ کرتے شمعِ ہدایت اگر حضور
ظلمت نصیب نور میں آتا نہیں کوئی

عشقِ نبی کے دعوے زبانوں پہ خوب ہیں
سنت کا دور دور بھی چرچا نہیں کوئی

رعنائیوں میں مکہ و طیبہ ہیں بے مثال
لاکھوں حسین شہر ہیں، اِن سا نہیں کوئی

ذی شان تھے مسیح و کلیم و خلیل و نوح
جامع صفات آپ کے جیسا نہیں کوئی

شانِ نبی میں لکھتا ہوں ہر لفظ پُر شکوہ
لیکن نگاہِ نعت میں جچتا نہیں کوئی

ثابت قدم رہے گا جو نقشِ رسول پر
روزِ حساب کا اُسے دھڑکا نہیں کوئی

میر و فقیر، شاہ و گدا ایک ہیں سبھی
دینِ نبی میں اعلیٰ و ادنیٰ نہیں کوئی

میراثِ مصطفےٰ تو ہیں علم و عمل فرید
اِن کے سوا حضور کا ورثہ نہیں کوئی

(فرید ندوی)

تبصرہ جات

تبصرہ: ضحیٰ

دسمبر کے شمارے کے سرورق پر نظر ڈالتے ہی بے اختیار ٹھنڈک اور تازگی کا سا احساس ہوا۔۔ ہلکے نیلے رنگ کے استعمال سے کی گئی ڈیزائننگ بہت خوبصورت لگی۔۔ ایک تازگی کا احساس لیے۔۔

سب سے پہلے عرض حال پڑھا، جو اس بار یاز غل بھائی نے لکھا۔۔ بہت عمدہ لکھا۔ دسمبر کے حوالے سے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ اور آخر میں سیکھنے سکھانے کے عمل سے متعلق جو پیغام دیا، بہت پسند آیا۔

اسلام سیکشن میں محسنہ جی کا مضمون جو عورتوں اور مردوں کے لباس میں فرق سے متعلق تھا۔۔ اس میں انہوں نے نہایت مفید باتوں کی طرف توجہ دلائی۔۔۔ مختصر مگر جامع لکھا۔۔۔

اسلام ہی کے سیکشن سے متعلق ایک چھوٹی سی تجویز بھی تھی کہ اگر اس سیکشن کے ہر صفحے پر ایک چھوٹی سورۃ یا چند آیاتِ قرآنی (بمعہ ترجمہ) کا اضافہ کیا جائے تو اس کا حُسن مزید دوبالا ہو جائے۔۔۔ جیسے کہ سیکشن کے تیسرے صفحے پر اس بار "سورہ التین" کا خوبصورت ڈیزائن مزین تھا.. بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔۔

دلپسند سیال بھائی کا بل گیٹس پر مضمون بہت عمدہ اور دلچسپ لگا۔۔ بل گیٹس کے بارے میں کافی باتیں ایسی تھیں جن سے پہلی بار آگاہی ملی۔۔ اس کے لیے ان کا شکریہ۔۔ مضمون کا چونکہ یہ پہلا حصہ تھا، سو باقی حصوں کا انتظار رہے گا۔

علاوہ ازیں مزاحیہ تحاریر کا سلسلہ تو لاجواب ہے۔۔ کائنات سس کی تحریر پڑھی۔ سادہ سی تحریر اور بے ساختہ انداز۔۔ بہت اچھا لکھا انہوں نے۔۔ پھر صبیح بھائی کی تحریر "ڈاکٹر ہو تو ایسا ہو" پڑھی۔۔ نہایت ہی دلچسپ احوال تھا۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کی بد حواسیوں نے بہت زیادہ محظوظ کیا۔۔

باقی تمام سلسلے بشمول مکتوبِ پنجاب یونیورسٹی، شعر و شاعری، آئی ٹی سیکشن کی "ٹپس اینڈ ٹرکس" اور گوشۂ خواتین سب ہی بہترین رہے۔۔

بس آخر میں ایک تجویز دینا چاہوں گی کہ اگر شمارے میں ایک الگ سیکشن مزاحیہ کارٹونز کا شامل کر دیا جائے تو وہ بھی ایک دلچسپ اضافہ ثابت ہو گا۔۔

والسلام۔

پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ یہ میگزین آپ سب کی شرکت اور حوصلہ افزائی کی بدولت ہی چل رہا ہے۔ امید واثق ہے کہ یہ سلسلہ مستقبل میں بھی یونہی جاری رہے گا۔ کارٹون کے سلسلے میں آپ کی تجویز پہلے ہی ہمارے پیشِ نظر ہے، لیکن اس کے لئے بھی ہم ون اردو ممبران کی جانب سے کارٹونز کی ترسیل پہ ہی انحصار کر سکتے ہیں۔ اگر کسی ممبر کی جانب سے کارٹون وصول نہ ہو تو پھر تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ شکریہ

☆---☆---☆

تبصرہ: آمنہ احمد

شمارہ دسمبر 2010 کا ٹائیٹل موقع مناسبت سے خوبصورت ہے اور قائد کا قول بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ عرض حال اس بار یاز غل بھائی کا لکھا ہوا ہے اور دسمبر کی اہمیت کا بہت خوبصورتی سے احاطہ کر رہا ہے۔ آیت، حدیث، حمد اور نعتِ رسول کی ڈیزائننگ بہت پرکشش لگی اور مضمون بھی۔ اس کے بعد نیسمہ بہن کی لکھی ہوئی تحریر "ایک حاجت مند حاکم کی کہانی" نے آبدیدہ کر دیا۔ "سورہ التین" کی ڈیزائننگ اور رنگوں کا امتزاج کمال کا رہا اور دل بار بار دیکھنے کو چاہا۔

مونا سید کی کہانی بہترین رہی۔ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ، ایک حساس موضوع ہمیشہ کی طرح۔ سائرہ علی کو پہلی بار پڑھا اور ان کی تحریر نے گہرا تاثر چھوڑا۔ "ڈاکٹر ہو تو ایسا" کی شگفتگی اور ڈاکٹر صاحب کی کارکردگی کا کیا ہی کہنا، بہت خوب۔ ندا سلیمان کے مضمون نے عورت کے حوالے سے بہت خوبصورتی سے ہمارے

معاشرے میں موجود مسائل کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد میں نے فہرست میں قائد اعظم پر کوئی تحریر دیکھنا چاہی مگر نہیں ملی۔۔۔۔ پھر جلدی جلدی تمام میگزین کھنگالا مگر سرورق کے علاوہ قائد اعظم محمد علی جناح کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میرے لئے یہ مایوسی کی بات بھی تھی اور لمحہ فکریہ بھی کہ جس شخص کی وجہ سے آج ہم اردو پر حق جمانے کے قابل ہوئے، اسے صرف سرورق کی زینت بنانے کے قابل سمجھا گیا۔۔۔ ویسے ہی جیسے قائد کی تصویر ہر نوٹ پر ہوتی ہے!

میگزین کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ آپ کی رائے اور تجاویز میگزین کی بہتری کے لئے ہمیشہ سے اہم رہی ہیں۔ قائد اعظم کے بارے میں تحریر موجود نہ ہونے والی بات قابلِ افسوس ضرور ہے، لیکن جیسا کہ بار بار عرض کیا جا چکا ہے کہ تحاریر کے سلسلے میں ہم اپنے ممبران کے ہی محتاج ہیں۔ اگر کسی جانب سے کوئی متعلقہ تحریر وصول نہ ہو تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

☆---☆---☆

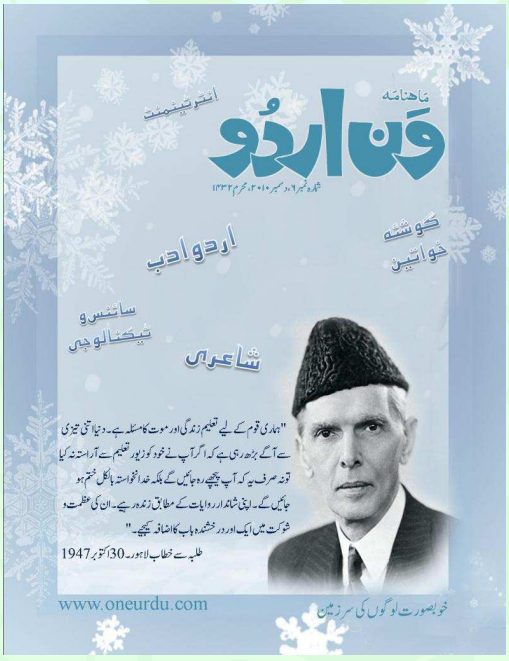

اسلام

حجاب

تحریر: سمیر

اللہ تعالٰی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے توسط سے اور شریعت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعے امت مسلمہ کی خواتین کو حجاب کی صورت میں ایک ایسا تحفہ دیا ہے کہ جس کی باقاعدہ پابندی کر کے امت کی ہر عورت چاہے وہ ماں، بیٹی، بہن یا بیوی ہو جسمانی طہارت کے ساتھ ساتھ قلبی طہارت و تقوٰی، پاکیزگی اور شرم و حیا جیسی اعلٰی صفات حاصل کر سکتی ہے۔

حجاب عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے بہت سارے مترادف معانی ہیں مثلاً ڈھانپنا، چھپانا، مخفی رکھنا، پردہ اور آڑ لینا۔ عام طور پر حجاب کے معانی سر کا رومال کے لیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حجاب کو عورت کا سادہ اور مکمل لباس بھی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی مختلف آیات اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بہت سی احادیث میں عورت کے اسلامی لباس کے بارے میں بیان ملتا ہے۔

ذیل میں پردے کے متعلق کچھ آیات اور احادیث بیان کی جا رہی ہیں۔

"اور مسلمان عورتوں کو حکم دو کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی پارسائی کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ نہ دکھائیں مگر جتنا خود ہی ظاہر ہے اور دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ یا شوہروں کے باپ یا اپنے بیٹے یا شوہروں کے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے بھتیجے یا اپنے بھانجے یا اپنے دین کی عورتیں یا اپنی کنیزیں جو اپنے ہاتھ کی مِلک ہوں یا نوکر بشرطیکہ شہوت والے مرد نہ ہوں یا وہ بچے جنہیں عورتوں کی شرم کی چیزوں کی خبر نہیں اور زمین پر پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ جانا جائے ان کا چھپا ہوا سنگھار اور اللہ کی طرف توجہ کرواے مسلمانو، سب کے سب اس امید پر کہ فلاح پاؤ۔" (النور-31)

"اے نبی اپنی بیبیوں اور صاحبزادیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرما دو کہ اپنی چادروں کا ایک حصّہ اپنے منہ پر ڈالے رہیں۔" (الاحزاب-59)

"عورت تو سراپا ستر ہے جب بے پردہ وُہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکنے لگتا ہے۔" (جامع ترمذی، حدیث نمبر-1206)

اللہ تعالٰی نے تم عورتوں کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضرورتوں کے لیے باہر جا سکتی ہو۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر-5237)

مسلمانوں کی عورتوں کے لباس کے بارے میں جو حکم آیا ہے وُہ یہ ہے:

۱۔ چہرے (کچھ فرقوں کے علماء کے مطابق) اور ہاتھ کے علاوہ مکمل جسم کو ڈھانپے۔

۲۔ اس حد تک ڈھیلا ہو کہ جسم کے خدوخال ظاہر نہ ہوں۔

۳۔ ہر طرح کی خوشبو سے پاک ہو تاکہ کسی کو اپنی طرف مائل نہ کر سکے۔

۴۔ مرد یا غیر مسلم عورتوں کے لباس جیسا نہ ہو۔

۵۔ ایسا لباس نہ ہو کہ جو اس عورت کو مغرور اور شہرت زدہ بنائے۔

۶۔ کپڑا اتنا پتلا نہ ہو کہ جسم نظر آئے۔

حجاب یا پردہ کے دینی فوائد تو اپنی جگہ لیکن اس کے دنیاوی فوائد بھی بہت سارے ہیں۔ ذیل میں کچھ حجاب کے دنیاوی فوائد کو بیان کیا جا رہا ہے۔

۱۔ حجاب عورت کی قدرتی خوبصورتی کی حفاظت کرتا ہے۔

۲۔ حجاب عورت کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

۳۔ عورت اللہ تعالٰی کے احکامات کی پابندی کرتی ہے اور اس طرح وُہ ایک انعام کی حق دار ٹھہرتی ہے۔

۴۔ مرد اس کو ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھتے۔

۵۔ اُس کی عزت کی جاتی ہے کیونکہ وُہ اپنی عزت خود کرتی ہے۔

۶۔ عورت کا بناؤ اور سنگھار نظر نہیں آتا جو وُہ خالصتاً اپنے شوہر کے لیے کرتی ہے۔

۷۔ حجاب سے عورت کا دل اور ذہن پاک ہوتا ہے۔

۸۔ عورت کے حجاب سے معاشرے میں سکون اور ٹھہراؤ آتا ہے کیونکہ اس سے شیطان دور بھاگتا ہے۔

حجاب کے اوپر بیان کیے گئے فوائد کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ حجاب کرنے والی عورتیں منہ اور چھاتی کے کینسر سے محفوظ رہتی ہیں اور یہ بات ریسرچ سے بھی ثابت ہو چکی ہے۔

عورت جب پردے میں گھر سے باہر نکلتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ مسلمان عورت ہے اور اُس کی عزت کی جاتی ہے۔ عورت کا چہرہ ہی ہے جو اس کی خوبصوتی کو بیان کرتا ہے اور کسی کی بھی چاہے وُہ مرد ہو یا عورت پہلی نظر اس کے چہرے پر پڑتی ہے۔ اسی طرح بہت سے حسن پرست عورت کے چہرے کو ہی دیکھ کر اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر عورت کے چہرے پر پردہ ہو گا تو یہ ساری باتیں نہ ہوں گی اور معاشرے میں بگاڑ پیدا نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ اوپر بیان کی گئی حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا مطلب ہی ستر یعنی پردہ کے ہیں اور اگر عورت پردہ میں رہے گی تو ہی اس کا اصل واضع ہو گا۔

جب بھی حجاب کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر عورت حجاب یا پردے میں رہے گی تو وہ دنیاوی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے ادا نہیں کر پائے گی مثلاً حجاب نوکری میں رکاوٹ پیدا کرے گا، وُہ پڑھائی اچھے طریقے سے نہیں کر پائے گی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان تمام سوالوں کے باوجود کوئی بھی چاہے وہ مرد ہو یا عورت حجاب یا پردے کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا اور نہ ہی وُہ آیات اور احادیث کو جھٹلا سکتا ہے۔

پردے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہر حکم خالصتاً ہماری بقاء اور فائدے کے لیے ہے۔ پردہ یا حجاب عورت کے لیے ایک نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن میں بار بار فرمایا ہے "اور تم اپنے رب کی کون کون سے نعمتوں کو جھٹلاو گے۔"

بہت سے لوگ یہ بھی سوال کرتے ہیں اور جو سچ بھی ہے کہ عورتیں پردے کرنے کے باوجود جرائم اور غلط کاموں میں ملوث ہوتی ہیں یا بہت سی عورتیں با پردہ ہونے کے باوجود پاکباز اور اچھی سیرت کی نہیں ہوتیں۔ اور ہمارے ارد گرد بہت سی مثالیں بھی ہیں۔ لیکن اس سب کے لیے حجاب یا پردے کو قصور وار ٹھہرانا ٹھیک نہیں ہو گا۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ پردہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اس کے فوائد جو بیان کیے گئے ہیں غلط نہیں ہو سکتے۔ عورت پہلے سے ہی غلط یا جرائم پیشہ ہو سکتی ہے اور وہ پردے کو ایک آڑ بنا رہی ہے۔ اس کو اتنا شعور ہی نہیں کہ پردہ ہے کیا۔ اس کے علاوہ گھر کا ماحول اور سوسائٹی جہاں اس کا اٹھنا، بیٹھنا ہے اس کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ صرف چہرے پر پردہ ڈالنے سے ہی کام نہیں ہو گا بلکہ عورت کو اپنے اندر حیا بھی پیدا کرنی ہو گی۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک حدیث جس کا مفہوم ہے:

"جب تم میں حیا نہ رہے تو جو مرضی کرتے پھرو۔"

اس حدیث میں بھی حیا کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ اگر انسان کے دل سے حیا ہی ختم ہو جائے گی تو کوئی بھی غلط کام کرنا اس کے لیے معمولی ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پہلے جتنے بھی نبی، رسول یا پیغمبر آئے اس کی تعلیمات صرف ایک خاص قوم کے لیے تھیں لیکن ان سب کی ایک تعلیم جو یکساں اور ہمیشہ کے لیے ہے وہ تھی "حیا"۔

بہت سے لوگ یہ بات بھی کرتے ہیں کہ حیا تو دل میں ہوتی ہے تو پھر پردہ کرنے کا کیا فائدہ؟ تو ان کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اگر ان کی بات سچ ہوتی تو قرآن میں اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اُن کی بیویوں اور صاحبزادیوں کو پردہ کرنے کا حکم کیوں دیتا؟ اُن سے زیادہ حیا والا اور پاکباز کون ہے؟

آج کل کے دور میں بہت سی این جی اوز عورتوں کے حقوق کے لیے سر گرم ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کی کرتا دھرتا عورتوں کا حلیہ دیکھ لیں تو ان کی عورت سے محبت واضح ہو جائے۔ عمر 50 سال سے اوپر ہونے کے باوجود بال مردوں کی طرح، کپڑے بہت مہنگے اور بناوٹی۔

اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ وعلیہ و آلہ وسلم کی پہلی زوجہ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تو مکہ کی ایک مال دار عورت تھیں اور آپ تجارت کرتی تھیں۔ اگر مکہ کے تمام تاجروں کا مال ایک طرف رکھ دیا جاتا اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مال ایک طرف تو بھی آپ کا مال ان سے زیادہ ہوتا۔ لیکن آپ اپنی مثال آپ ہیں۔ مکہ کی عورتوں میں آپ ایک پاکباز، حیا دار اور شریف عورت تھیں۔ اگر کوئی عورت اب نوکری کرتی ہے اور مثال حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دیتی ہے تو اس سے گزارش ہے کہ پہلے خود میں ان جیسی خوبیاں تو پیدا کرے۔

☆---☆---☆

اسلام کی طرف لوگوں کو بلانا

تحریر: ڈاکٹر یوسف قرضاوی

ترجمہ: احمد غزنوی

اسلام کی طرف بلانا مسلمانوں کے اہم فرائض میں سے ایک ہے۔ اگر مسلمان خود صالح ہو اور نیک اعمال پر مداومت کرتا ہو مگر دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ رکھتا ہو تو یہ کافی نہیں کیونکہ اسلام نے دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری بھی اس کے سپرد کر رکھی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کی نجات کی راہ کی نشاندہی سورۃ العصر میں کر دی ہے۔

وَالْعَصْرِ (۱) إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ (۲) إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)

ترجمہ: "قسم ہے زمانے کی۔ یقیناً، انسان خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور کرتے رہے نیک عمل۔ اور نصیحت کرتے رہے ایک دوسرے کو حق کی اور تلقین کرتے رہے ایک دوسرے کو صبر کی۔"

پس صرف ایمان لانا اور نیک عمل کرنا کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حق کی طرف بلانا اور اس کی وصیت کرنا اور حق کو ماننا بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ یہ بہت اہمیت رکھنے والی بات ہے۔

جیسا کہ حضرت لقمان اپنے بیٹے کو کہتے ہیں:

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

ترجمہ: اے میرے بیٹے! قائم کرو نماز اور حکم دیتے رہو نیک کاموں کا اور منع کرتے رہو بدی سے اور ثابت قدم رہو اُس تکلیف پر جو پہنچے تمہیں (اس راستہ میں) یقیناً یہی ہیں بڑی ہمّت کے کام۔ (سورۃ لقمان:17)

صبر بھی ایک انتہائی اہم چیز ہے۔ داعی جو لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا اور سچائی کی طرف بلاتا ہے، خاص طور پر اس دور میں جب دعوتِ دین کے ساتھ بہت ساری مشکلات ہیں، اگر صبر سے کام نہ لے اور ان سختیوں کا سامنا کرنے کیلئے سینہ سپر نہ ہو تو اس کیلئے کامیابی کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نبوت کے دور میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا

ترجمہ: "یقیناً ہم نازل کرنے والے ہیں تم پر ایک بھاری کلام" (سورۃ المزمل:5)

دعوتِ دین ایک بہت بھاری بوجھ ہے اور ہم نے وارثین کی حیثیت سے اس بوجھ کو اٹھانا ہے۔

ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دین کی دعوت دینا، حق بات کرنا اور نیکی کا حکم کرنا و برائی سے روکنا ایک عظیم بار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے دین کو پسِ پشت ڈال دیا ہے، ان کا یقین کم ہو گیا ہے اور انہوں نے اپنا رخ دنیا کی طرف موڑ لیا ہے، آخرت کی جانب اپنی پیٹھ کر لی ہے۔ بھلائی کے کام لوگوں نے چھوڑ دیئے ہیں اور برائی کے کام شروع کر دیئے ہیں۔

یہیں سے دعوت کا بار داعیانِ اسلام پر بہت بڑھ جاتا ہے۔ مشکلات میں اس حد تک اضافہ ہو گیا ہے کہ سب لوگ آپ کو یہ نصیحت کریں گے کہ بے جا باتوں کی جانب دھیان مت دو۔ تمہیں اور کوئی کام نہیں کہ ان کاموں میں پڑ گئے ہو اور اپنے لیے مشکلات اور سختیاں پیدا کر رہے ہو۔ لوگ کہتے ہیں: "ہو سکتا ہے تمہیں گرفتار کر کے کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے، ہو سکتا ہے تمہیں ملک بدر کر دیا جائے، تمہیں سخت اذیتوں کا نشانہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ کیوں اتنے مصائب کو دعوت دیتے اور ان میں الجھتے ہو؟ جب سب لوگوں کو اس کی پروا نہیں تو تم اکیلے اس کے ٹھیکے دار کیوں بنتے ہو؟" یہ اور اسی طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں تاکہ اس فریضے کی ادائیگی سے آپ کے دل کو پھیر دیا جائے۔

موجودہ دور میں دعوتِ دین اور دینداری پر قائم رہنے کے مقابلے میں مصائب اور مشکلات اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان بہن کہیں شرعی پردے کا اہتمام کرتی ہے اور خود کو چھپاتی ہے تو اس کے اپنے گھر والے اسے استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں۔

گذشتہ سال ایک لڑکی جس سے میں واقف تھا اور وہ بہت اچھے اسلامی طریقے سے ملبوسات کا استعمال کرتی تھی۔

اس سال مجھے کسی نے بتایا کہ اُس نے یہ سب چھوڑ دیا ہے، شرعی پردہ ترک کر دیا ہے اور بالکل بدل گئی ہے، مغربی طرز کے عریاں ملبوسات پہنتی ہے۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ اُسے اپنے گھر والوں کی جانب سے دباؤ کا سامنا تھا۔ اس کے رشتے دار اور دوست اُس کا مذاق اڑاتے تھے اور اُس پر ہنستے تھے۔

آج کل لوگ شرعی اور اسلامی لباس کو استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں اور اُس پر ہنستے ہیں!!!

یہ ایک فطری امر ہے کہ مسلمان خاتون کبھی بھی ایسی باتوں کے اثرات قبول نہیں کر سکتی اور نہ اپنے شرعی مؤقف سے پیچھے ہٹتی ہے۔ وہ اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والی ہوتی ہے۔ مگر اُس کے مقابلے میں ضعیف ایمان کی حامل خاتون اپنی شخصیت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے، لوگوں کے استہزاء کے زیر اثر آ جاتی ہے اور

شرعی مؤقف سے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں مسلمان عورت اپنا اسلامی لباس ہٹا دیتی ہے اور مغربی خواتین کا حلیہ اپنا لیتی ہے۔ وہ اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیتی ہے۔ اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"یأتي علی الناس زمان القابض فیھم علی دینہ کالقابض علی الجمر"

ترجمہ:"لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں دین پر قائم رہنے والا ایسا ہو گا جیسے اپنی مٹھی میں انگارہ پکڑے رہنے والا"(ترمذی)

اس وقت میں جب کہ مشکلات حد سے بڑھ چکی ہیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اسلام پر عمل کرنے والے مسلمان کو اجر بھی اسی قدر زیادہ دیتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ اسلام کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور اسلام پر حریص ہوں، اوروں کو بھی اسلام کی جانب بلائیں خواہ ہمیں اس کے نتیجے میں مخالفتیں برداشت کرنی پڑیں یا ہمیں گھریلو، سیاسی یا معاشرتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑے۔

ہمیں چاہیے کہ ہر قسم کے دباؤ کا سامنا کریں، لازم ہے کہ اس دباؤ کے مقابلے میں ہم خود کو توانا کریں۔ زمین کے اوپر کوئی داعی ایسا نہیں گزرا جسے مخالفتوں اور مصائب و شدائد کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس بارے میں فرماتے ہیں:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ

ترجمہ:"اور اسی طرح ہم نے شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے تھے اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان کو اور جو کچھ یہ افتراء کرتے ہیں اسے چھوڑ دو"(سورۃ الانعام:112)

ایک اور مقام پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ

ترجمہ:"اور اسی طرح ہم نے گنہگاروں میں سے ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا۔"(سورۃ الفرقان:31)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بھی پیدا فرمایا ہے اور ابلیس کو بھی۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بھی پیدا فرمایا ہے اور نمرود کو بھی۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی پیدا فرمایا ہے اور فرعون کو بھی۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیدا فرمایا ہے اور ابو جہل کو بھی۔

ہر زمانے میں ابراہیم علیہ السلام اور نمرود۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آدم علیہ السلام اور ابلیس موجود ہیں (نیکی و بدی مراد ہے) صرف ان کے نام اور وقت کا فرق ہے۔

یہ عصر جس طرح ٹیکنالوجی کا دور کہلاتا ہے، عین اُسی طرح یہ نظریاتی دور بھی ہے۔ کمیونزم کے اپنے مددگار موجود ہیں، ماسونیت کے علیٰحدہ مددگار ہیں، یہودیت اپنے الگ مددگار رکھتی ہے اور نصرانیت کے اپنے مددگار و راہبان موجود ہیں، قادیانیوں اور بہائیوں کے اپنے مددگار ہیں اور ہر منحرف راستے پر چلنے والوں کے اپنے اپنے مددگار موجود ہیں۔

تو کیا اسلام کے اپنے مددگار اور اس کی جانب بلانے والے موجود نہیں ہیں؟؟؟

یہ اسلام کی فطرت ہے کہ وہ دعوت اور اپنی جانب بلائے جانے کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ

ترجمہ:"اور اس سے اچھی بات کس کی ہو گی جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں یقیناً فرماں برداروں میں سے ہوں۔"(سورۃ حم السجدۃ:33)

پس مسلم نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دلوں میں اسلام کا درد اور احساس پیدا کریں اور اللہ کے دین کی جانب لوگوں کو دعوت دیں۔ اس دور میں اس سے بڑھ کر اور کوئی کام بھی نہیں کہ یہی تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا وظیفہ رہا ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جس پر چل کر مسلم نوجوان دین کو مضبوطی سے پکڑے رہ سکتے ہیں۔

☆---☆---☆

لباس اور تکبر

تحریر: سمیر

تکبر کی اقسام میں سے ایک قسم یہ ہے کہ انسان اچھا لباس پہنے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوگوں نے دیکھا کہ ہاتھ میں درہ ہے اور چادر میں چودہ پیوند لگے ہیں ان میں سے بعض پیوند چمڑے کے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ معمولی درجے کا کپڑا زیب تن فرماتے۔ لوگوں نے شکایت کی تو فرمایا کہ میاں اس طرح دل میں خشوع رہتا ہے اور لوگ پیروی کرتے ہیں، فقراء خوش ہوتے ہیں۔ حضرت طائوس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب میں دھلے ہوئے کپڑے پہنتا ہوں تو پھر جب تک وُہ میلے نہ ہو جائیں میرا دل رعونت کا شکار رہتا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ خلافت سے پہلے چار ہزار دینار کا لباس زیب تن فرماتے اور فرماتے کہ "یہ بھی اچھا ہے لیکن اور نرم ہو تو زیادہ اچھا ہے۔" لیکن خلافت کے بعد پانچ درہم کے کپڑے پر قناعت کر لی اور ارشاد ہوتا کہ "اس سے بھی زیادہ موٹا اور کھردرا ہو تو اچھا ہے۔" لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا نفس دیا ہے جو لذت طلب ہے ایک چیز کی لذت چکھنے کے بعد اسے دوبارہ طلب نہیں کرتا اب خلافت کا مزہ چکھ لیا ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی مزہ نہیں اس لیے اب ابد کی بادشاہی کی طرف دوڑنا اور اسے تلاش کرنا ہے۔

لیکن یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ جتنے اچھے کپڑے ہیں سبھی تکبر کے سبب ہیں کیونکہ بعض آدمی ہر چیز میں اچھائی کو محبوب رکھتے ہیں۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ خلوت و تنہائی میں بھی وہ آدمی اچھے کپڑے پہنتا ہو جبکہ بعض لوگ پرانے کپڑوں کو پہن کر تکبر کرتے ہیں کہ اس طرح اپنے زہد کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے فرمایا کہ تم نے باطن تو بھیڑیئے کا سا بنا رکھا ہے لیکن ظاہر راہبوں جیسا ہے اس کے بجائے ظاہر بادشاہوں جیسا بناؤ اور دل اللہ کے خوف سے معمور رکھو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کے دورہ پر تشریف لے گئے تو کپڑے پھٹے پرانے تھے لوگوں نے دشمن کے علاقہ کے پیش نظر اچھے کپڑے پہن لینے کی درخواست کی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اسلام کے سبب مجھے عزت بخشی ہے اس لیے اب میں کسی چیز میں عزت تلاش نہیں کروں گا۔

الغرض جو تواضع سیکھنا چاہے اسے سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم معلوم کر کے اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جانوروں کو چارا ڈالتے، اونٹ کو باندھتے، گھر میں جھاڑو خود دیتے، بکری کا دودھ خود دوہتے، اپنے جوتوں میں خود ٹانکا لگاتے اور کپڑے میں بوقت ضرورت پیوند بھی لگا لیتے۔ خادم کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ چکی پیسنے میں اس کا ہاتھ بٹاتے، بازار سے چادر میں سودا سلف باندھ کر لے آتے اور امیر فقیر سبھی کو سلام میں پہل فرماتے۔ دن کے معاملات میں کسی میں فرق نہ فرماتے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دن رات کا لباس ایک ہی تھا۔ جو خاکسار پریشان حال آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کرتا اُسے قبول کر لیتے۔ کھانا چاہے جس بھی قسم کا ہو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے رکھ دیا جاتا اُسے تناول فرما لیتے۔ ایک وقت کے بعد دوسرے وقت کے لیے کھانا بچا کر نہ رکھتے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نیک خو، کریم الطبع، ملنسار اور شگفتہ رو تھے۔ مسکراتے ضرور لیکن قہقہہ نہ لگاتے، غم میں تیوری نہ چڑھاتے، متواضع تھے لیکن مذلت کا رویہ اختیار نہ فرماتے، خداداد ہیبت کے مالک تھے۔ طبیعت میں درشتی و سختی نہ تھی۔ سخی اور کریم تھے، لیکن اسراف نہ تھا۔ سب لوگوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دل بہت نرم تھا، سر جھکا کر رکھنا آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عادت تھی اور اس کی وجہ شرم و حیا کا غلبہ تھا۔ طبیعت میں کسی قسم کا طمع نہ تھا۔ جو سعادت کو مطلوب رکھتا ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیروی کرے اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعریف میں فرمایا:

"ہم نے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خلق عظیم کا مالک بنایا ہے"

"القلم"

"کیمیائے سعادت" از "امام ابو حامد محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ"

ترجمہ "مولانا محمد احمد، فاضل جامعہ امدادیہ، فیصل آباد"

"صفحہ 425،426"

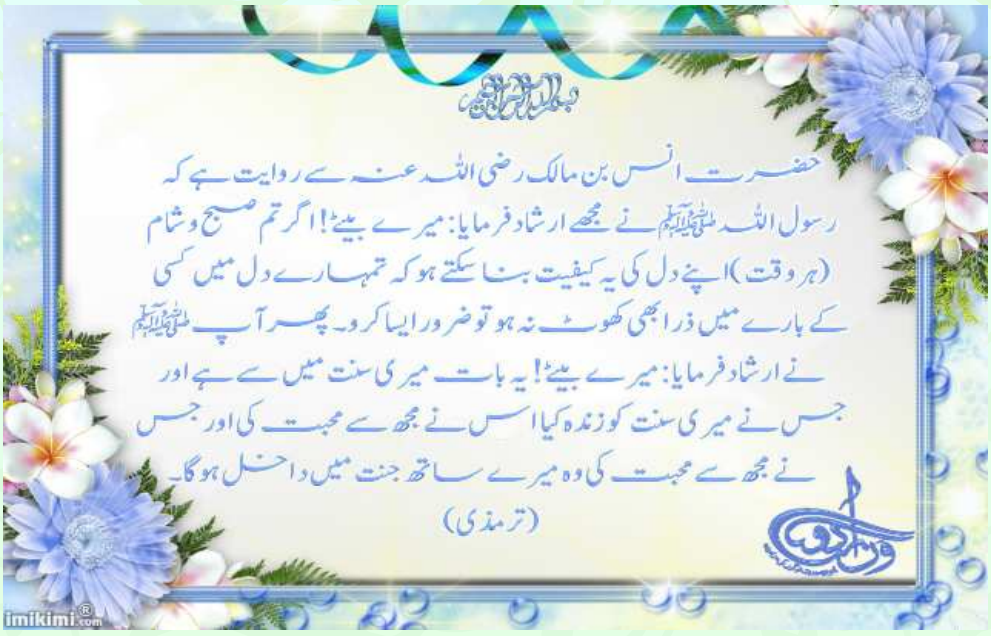

اردو ادب انشائیہ

جسمانی غلامی اور ذهنی غلامی

رض چوہدری

اک وقت تھا جب دنیا میں انسانوں کی جسمانی غلامی کا چرچا عام تھا۔ انسانوں کی بھی منڈیاں لگتی تھیں، ان پر بھی بولیاں لگائی جاتی تھیں۔ انسانوں کو سر عام خریدا اور بیچا جاتا تھا مذہب سے ہٹ کر، معاشرہ سے ہٹ کر اور ایسا سلسلہ کئی ادوار تک چلتا رہا۔

انسانوں کی ایسے جانوروں کی طرح خرید و فروخت پر انسانی حققوق کی نام نہاد تنظمیں حرکت میں آئیں لوگوں میں شعور پیدا کیا گیا اور آہستہ آہستہ جسمانی غلامی کا سلسلہ رُکتا گیا اور وہ دور ختم ہوا۔

اب اک نیا دور ہے ایک ایسا دور جس میں لوگوں کے پاس علم اور شعور بھی ہے اس دور میں انسان نے ترقی بھی بہت کی۔ مگر اسکی ایک فطری حیوانی تسکین بدل نہ سکی یعنی "انسانوں کو اپنے تابع رکھنا"۔

اس ماڈرن انسانیت نے سوچا کہ اب انسان کی جسمانی غلامی ممکن نہیں اس لیے کوئی ایسا طریقہ کوئی ایسا راستہ سوچا جائے کہ جس سے اس کی انسانیت کو حیوانی تسکین بھی مل جائے اور دنیا اس پر انگلیاں بھی نہ اٹھائے۔ تب ہی انسانیت کے شاطروں نے انسانوں کو ذہنی غلام بنانا شروع کر دیا۔

اور ساتھ ہی ذہنی غلامی کا دور شروع ہوا جو کہ موجودہ دور میں اپنے عروج پر ہے۔

کیا ہے ذہنی غلامی۔۔۔؟

"ذہنی غلامی جسمانی غلامی سے کہیں بدتر اور خطرناک ہے۔

جس میں انسان دنیا کی نظروں میں ایک خود مختار انسان کہلاتے ہیں۔ بظاہر تو آزاد زندگی گزارتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ انتہائی مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ اور ان کا عمل مختلف طرح کے احکامات اور پابندیوں میں جکڑا ہوتا ہے۔"

سب سے اہم بات جسمانی غلامی میں انسان کو غلام بننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

مگر ذہنی غلامی میں انسان خود اپنی مرضی سے دوسروں کا تابع ہوتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے پُتلی تماشے میں ناچتی تو پُتلیاں ہیں، مگر ڈوریں کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔

اس شاطر انسانیت پن نے ایسے نئے نئے طریقے ڈھونڈنے شروع کیے کہ انسان انہیں کی جانب راغب ہوتا گیا۔ اس نے انسان کو،

" معاشرہ کو بھول کر واحدنیت کا طریقہ بتایا۔"

" معاشرہ کے مجموعی مفادات کے بجائے صرف اپنے مفادات کو ترجیح دینا سکھا دیا۔"

"علم کی بجائے دولت کے حصول میں حرص کرنا سکھا دیا۔"

"دوسروں کے لیے اپنی جان دینے کی بجائے خود کو زندہ رکھنے کے لیے دوسروں کا مارنا سکھا دیا۔"

" مذہب کو پرائمری کی بجائے ثانوی درجہ پر لا کھڑا کیا۔"

"مذہب پر سیدھا سیدھا چلنے کی بجائے اس کے نام پر ایسے طریقے نکالے جس نے شیطانیت کو سرعام کیا جس نے اس کو شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا سکھا دیا۔"

جو جو اس شاطر انسانیت کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے گئے، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تھے، وہ ذہنی طور پر غلام بنتے گئے۔

جس میں سب سے بڑی تعداد اُمت مسلمہ کی ہے جو ایک مکمل مذہب رکھنے کے باوجود، انہیں راستوں پر چلتے گئے اور بالآخر آج کے دور میں وہ بدترین ذہنی غلامی کا شکار ہیں۔

مسلم دنیا پر نظر ڈالی جائے تو حقیقت میں کوئی اسلامی ملک اس ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہے۔ مگر ہر ملک اسی چیز کا دعوٰی کرتا ہے کہ وہ ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت موجودہ وکی لیکس میں شائع ہونے والی وہ حقیقی دستاویزات ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً سارے اسلامی ممالک کے سربراہان اپنے اپنے ملکوں میں ہونے والے اہم واقعات اور اس کے نتیجے میں کئے جانے والے ہر اقدامات سے امریکہ کو آگاہ کرنے کے پابند ہیں۔

اگر انسان نے اور خاص کر آج کے مسلمان حکمرانوں نے خود اور اپنی ریاست کی عوام کو غلام بننا ہی ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ یہ ذہنی غلامی چھوڑ دے اور جسمانی غلامی قبول کرلے کم از کم جسمانی غلامی میں انسان کا "ضمیر مردہ تو نہیں ہوتا"

"بے حسی کی انتہا تو نہیں ہوتی۔"

"ماؤں بہنوں کی لٹی ہوئی عزتوں پر آنکھیں بند تو نہیں کی جاتی۔"

"مرتے ہوئے معصوم بچوں کو دیکھ کر آنکھیں نم تو ہوتی ہیں۔"

"اجڑے گھروں کو دیکھ کر اک آہ تو نکلتی ہے۔"

"ایک دوسرے کی تکلیف پر مرہم تو رکھا جاتا ہے۔"

"انسان اپنی ذاتی سوچ تو رکھ سکتا ہے۔"

"اپنوں پر کئے گئے مظالم کو روکنے کی خواہش تو رہتی ہے۔"

"آزادی حاصل کرنے کی کوشش تو رہتی ہے۔"

تاریخ گواہ ہے کہ اگر کوئی حقیقت میں اس شاطر انسانیت کا تابع ہونے سے انکار کرتا ہے۔ شاطر انسانیت کی ذہنی غلامی سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کا حال، بے حال کر دیا جاتا ہے۔

وہ اتنا معذور ہو جاتا ہے کہ خود سے چلنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔

ان کی سسکتی ہوئی آوازوں کو سننے والا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔ مگر ان سب تکلیفوں کے باوجود جو اس کو ذہنی غلامی قبول نا کرنے کی وجہ سے ملی، وہ ایک انسان ضرور رہتا ہے۔ جو کہ آج کی دنیا میں بہت بڑی بات ہے۔

اگر جسمانی غلامی میں کسی ایک انسان کے مرنے پر دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے۔ کسی کے لُٹنے پر درد محسوس ہوتا ہے، تو جسمانی غلامی کی زندگی، ذہنی غلامی کی بے حس، عیش و آرام اور بے مقصد آزادی سے لاکھ درجے بہتر ہے۔

عجیب اتفاقاتِ زمانہ ہے کہ دس ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن سے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے ملکہ معظمہ برطانیہ کی طرف سے تقسیم ہند کا پروانہ دیا۔

قائد اعظم کی کوٹھی ڈس اورنگ زیب روڈ نئی دہلی سے مملکتِ خداداد پاکستان کے قیام اور قائد اعظم کے پہلے گورنر ہونے کا اعلان کیا گیا۔

ملاحظہ فرمائیں کہ حکومت دس ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن سے دس اورنگ زیب روڈ دہلی منتقل ہوئی اور وہاں سے مستقلاً دس وکٹوریہ روڈ کراچی آگئی۔

اقتباس: بے تیغ سپاہی از نواب صدیق علی خان

ناول/ناولٹ/ افسانے

قسط نمبر پانچ

ترجمہ از نون الف

بنیاد پرست

تم ان چمگادڑوں کو دیکھ رہے ہو؟ کیا کہا؟ کرہی۔ ہاہا، تم امریکیوں کے پاس یہ بڑے مزے کی اصطلاح ہے۔ میں نے آج نہ جانے کتنے سالوں بعد پھر سے سنی ہے۔ خیر، مجھے یہ کرہی نہیں لگتیں بلکہ خاصی پسند ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا ہے جب ہم اپنے دادا کے سوئمنگ پول میں نہارہے ہوتے تھے اور یہ ہمیں شاید مینڈک سمجھ کر ہم پر گرتی تھیں۔ اس زمانے میں لاہور میں ان کی کئی نسلیں آباد تھیں جن میں سے کچھ، جنہیں میرے والد اڑن لومڑی کا نام دیتے تھے، حجم میں کہیں بڑی تھیں۔ اکثر شام کے وقت مال روڈ سے کار میں گزرتے ہوئے وہ ہمیں بوڑھے درختوں کی شاخوں سے الٹی لٹکی نظر آتی تھیں۔ اب وہ یہاں نہیں رہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تتلیوں اور جگنوؤں کی طرح انہیں بھی صرف وہ خوابناک ماحول راس آتا ہو جس کا ایک میٹروپولیٹن کی آلودگی اور بے پناہ آبادی میں تصور بھی ممکن نہیں۔ سو اب انہیں فقط مضافاتی علاقوں میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ چھوٹی چمگادڑیں اب بھی یہیں ہیں۔ انہیں میری اور تمہاری طرح شہروں میں بسنے کا ڈھنگ آتا ہے کیونکہ ان کی تیزی و طراری انہیں پکڑے جانے سے بچانے کے ساتھ ساتھ ہجوم کے بیچ میں شکار کرنا بھی سکھا دیتی ہے۔ مجھے رشک آتا ہے ان کی صلاحیتوں پر، چاہے عمارت کے کتنی ہی نزدیک کیوں نہ پہنچ جائیں، ٹکراتی کبھی نہیں ہیں۔

دوسری طرف تتلیاں ہیں جن کا کام ہی چلتی گاڑیوں کی ونڈ شیلڈ سے ٹکرا کر جاں بحق ہونا ہے اور ایک دفعہ میں نے ایک جگنو کو ایک گھر کی کھڑکی سے متواتر ٹکراتے دیکھا تھا، اسے اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ اس کا راستہ ایک شیشے نے روک رکھا ہے۔ شاید اڑن لومڑیوں کا ڈار اتنا طاقتور نہیں تھا یا پھر ان میں پھرتی کا فقدان تھا، بہر حال بلند عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ان سے ٹکرا کر مرنے کے نتیجے میں اس نسل کی تعداد گھٹتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ وہ یہاں سے بالکل معدوم ہو گئیں۔ اسی سبب سے نیویارک میں ان کا خاتمہ مزید بہت عرصہ پہلے ہو چکا ہونا چاہیے، بلکہ منیلا میں بھی!

جب میں نے اپنے انڈر ووڈ سیمسن کے پہلے اسائنمنٹ کے لیے منیلا میں قدم دھرے تو میرے جوش کی کوئی حد نہیں تھی۔ ہم بذریعہ فرسٹ کلاس آئے تھے اور مجھے سوٹ پہنے ہوئے اپنی نشست پر نیم دراز ہو کر ایک بے حد پرکشش اور ضرورت سے زیادہ بے تکلف ایئر ہوسٹس کے ذریعے شیمپین سرو کیے جانا ہمیشہ یاد رہے گا۔ اپنی نظروں میں اس وقت میں بالکل جیمز بانڈ تھا، صرف یہ کہ میری عمر کم، رنگت گندمی اور معاوضہ غالباً کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس وقت کو یاد کرنا اب کتنا عجیب لگتا ہے کیونکہ یہ خود اطمینانی کی کیفیت بہت جلد ختم ہو جانے والی تھی!

لیکن میں غالباً زیادہ آگے چلا گیا۔ میں تمہیں منیلا کے متعلق بتا رہا تھا۔ کیا تمہارا وہاں جانا ہوا ہے؟ ہوا ہے نا! ایک عام امریکی کی نسبت، بلکہ کسی بھی ملک کے عام شہری کے مقابلے میں تم نے کہیں زیادہ سفر کر رکھا ہے۔ تمہارے کام کی نوعیت کے متعلق میرے تجسس میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ موقع آنے پر تم مجھے اس بارے میں ضرور بتاؤ گے، ابھی تم چاہتے ہو کہ میں اپنی بات جاری رکھوں۔ اب چونکہ تمہارا اس طرف جانا ہو چکا ہے اس لیے مجھے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ وہاں تبدیلی کتنی ہوشربا تیزی سے آرہی ہے۔ مجھے لاہور کی طرح کا شہر دیکھنے کی توقع تھی، یا زیادہ سے زیادہ کراچی جیسا؛ لیکن میرا واسطہ ایک فلک بوس عمارتوں اور تیز ترین سڑکوں سے اٹے ہوئے شہر سے پڑا۔ ہاں، منیلا میں کچی آبادیاں بھی ہیں، ایئرپورٹ سے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے ہمیں میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے بے شمار آدمی گاڑیاں ریپیئر کرنے کی دکانوں پر سست رفتاری سے کام کرتے بھی دکھائی دیے۔۔۔ جیسے پچاس کے عشرے پر بنی "گریس" جیسی فلموں کے امریکا کا غریب تر ورژن ہو۔ لیکن منیلا کی چمکتی دمکتی عمارتوں کے اندر اور باہر بے پناہ امارت کے جو مظاہر مجھے دیکھنے کو ملے، پاکستان میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے اس تقابل کو جلد از جلد ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی؛ یہ تسلیم کرنا بہت آسان تھا کہ نیویارک لاہور سے زیادہ امیر ہے مگر یہی بات منیلا کے متعلق ہضم کر لینا کہیں مشکل تھا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ کسی طویل فاصلے کی دوڑ میں آپ خود کو اچھی پوزیشن پر سمجھتے سمجھتے گردن موڑ کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ وہ جو ابھی ابھی آپ سے آگے نکلا ہے وہ سب سے اچھا دوڑنے والا نہیں بلکہ وہ ہے جسے آپ کسی خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ منیلا میں، میں نے، جہاں تک میری عزت نفس نے اجازت دی، امریکیوں جیسا رکھ رکھاؤ برتنا شروع کر دیا، حالانکہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ کام کرنے والے فلپائنی میرے امریکی ساتھیوں کو جبلی طور پر عالمی کاروبار کی آفیسر کلاس کا حصہ سمجھ کر ان کی تکریم کرتے تھے۔۔۔ مجھے بھی اس میں اپنا حصہ درکار تھا۔

چنانچہ میں نے اپنے والد کی عمر کے ایگزیکٹوز سے "مجھے یہ چیز چاہیے، ابھی!" جیسے جملے کہنے سیکھ لیے۔ میں نے ایک عالمگیر مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر لائن میں آگے جا کر کھڑے ہو جانا سیکھ لیا؛ اور میں نے جان لیا کہ اپنے متعلق ایک اہم سوال کا جواب کیا دینا ہے، یہ کہ میرا تعلق نیویارک سے ہے۔ تم پوچھتے ہو کہ کیا ان چیزوں نے مجھے کبھی پریشان کیا؟ بالکل؛ اکثر مجھے خود سے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن باہر میں نے یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔

بہر حال میرے پاس فخر کرنے کو بھی بہت کچھ تھا، مثلاً اپنے کام کی طرف میرا حقیقی رجحان اور اور اس حوالے سے میری صلاحیت جس کی گواہی میرے ساتھیوں کے انتہائی مثبت تبصروں سے بھی ملتی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ہماری وہاں موجودگی کی وجہ ایک میوزک ریکارڈنگ بزنس تھا۔ کاروبار کا مالک مقامی طور پر اس فیلڈ کے تجربہ کار ترین لوگوں میں سے تھا؛ جب کبھی وہ اپنی آنکھوں سے سن گلاسز ہٹاتا تو ان میں ایل ایس ڈی کے طویل استعمال کے اثرات واضح دکھائی دیتے۔ لیکن اپنے رنگین ماضی کے باوجود اس نے دو بڑے عالمی موسیقی کے اداروں کے ساتھ بہت مہنگے سودے کر رکھے تھے اور اگر اس کے کہے پر یقین کیا جاتا تو پائیریسی، ڈاؤن لوڈ اور چین کی جانب سے سخت مقابلے کے باوجود جنوب مشرقی ایشیا میں اس کا اپنی نوعیت کا سب سے بڑا کاروبار تھا۔

اس کاروبار کی درست قدر و قیمت کیا تھی، یہ جاننے کے لیے ہم مہینہ بھر دن رات کام کرتے رہے۔ ہم نے سپلائرز، ملازمین اور ہر قسم کے ماہرین کے انٹرویو کیے؛ ہم نے گھنٹوں بند کمروں میں وکلاء اور اکاؤنٹنٹس کے ساتھ وقت گزارا؛ ہم گیگا بائیٹس کے اعتبار سے معلومات جمع کرتے رہے؛ ہم نے کارکردگی کی جانچ کے لیے مختلف پیمانوں اور موازنہ جات کا استعمال کیا؛ یہاں تک کہ بے شمار مرتبہ ردوبدل کرنے کے بعد ہم نے ایک پیچیدہ مالیاتی نمونہ تیار کر لیا۔

اس دوران میرا زیادہ تر وقت کمپیوٹر کے سامنے گزرا لیکن ساتھ ساتھ میرا فیکٹری اور بہت سی موسیقی کی دکانوں کا بھی چکر لگتا رہا۔ ایسی ہر آؤٹنگ پر یہ سوچ کر کہ ہماری ٹیم کے کام پر اس ادارے کے مستقبل کا دارومدار ہے، مجھے بے پناہ طاقت کا احساس ہوتا تھا۔ کیا یہ ملازمین فارغ کر دیے جائیں گے؟ کیا یہ سی ڈیز کہیں اور بنائی جائیں گی؟ بالواسطہ طور پر یہ ہم ہی طے کرنے والے تھے۔

اس سب کے باوجود، کچھ مواقع ایسے بھی آئے جب میں خود کو اس سب سے کٹا ہوا محسوس کرنے لگتا تھا۔ ایسا ایک موقع مجھے خاص طور سے یاد ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لیموزین میں سوار تھا۔ ہم ٹریفک میں بری طرح پھنسے تھے اور حرکت کرنے سے قاصر تھے، ایسے میں میری نظر کھڑکی سے باہر گئی اور میں نے چند فٹ کے فاصلے پر ایک جیپنی کے ڈرائیور کو اپنی ہی جانب دیکھتے پایا۔ اس کے تاثرات سے بہت کھلی نفرت مترشح تھی، اور مجھے اس کی وجہ بالکل معلوم نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے تھے اور غالب امکان یہی تھا کہ اگلے چند منٹ بعد ہم پھر سے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہونے والے تھے۔ لیکن اس کی ناپسندیدگی اس قدر واضح، اتنی گہری تھی کہ میں اس کا اثر قبول کیے بنا نہ رہ سکا۔ میں نے بھی جواباً اسے غصے سے گھورنا شروع کر دیا۔۔۔ تم نے اب تک اندازہ کر لیا ہو گا کہ ہم لاہوری لوگ گھورے جانے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔۔۔ تو میں بھی اسے تب تک اسی کے انداز میں دیکھتا رہا جب تک ٹریفک دوبارہ رواں نہیں ہو گیا اور نتیجتاً اسے اپنی توجہ سڑک کی طرف مبذول کرنی پڑی۔

بعد میں میں نے اُس کے اِس عمل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے سوچا شاید اس کی بیوی آج کل میں اسے چھوڑ گئی ہو؛ یا ممکن ہے وہ میری اس برتری پر ناراض ہو جو میرے سوٹ اور مہنگی کار میں سوار ہونے کے باعث مجھے اس پر حاصل تھی؛ یا پھر شاید اسے امریکیوں سے ویسے ہی نفرت ہو۔ میں اس موضوع پر اس سے کہیں زیادہ وقت سوچ بچار کرتا رہا جتنا مجھے کرنا چاہیے تھا، کئی امکانات پر غور کرتا رہا۔۔۔ لاشعوری طور پر سب کا ابتدائی نکتہ ایک ہی تھا۔۔۔ کہ میرے اور اس کے بیچ ایک قدر مشترک تھی، تیسری دنیا کی حساسیت۔ پھر میرے ساتھیوں میں سے ایک نے مجھ سے کچھ پوچھا، اور جب میں اس کی بات کا جواب دینے کے لیے مڑا تو ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کے بالوں اور ہلکی رنگت والی آنکھوں پر غور کیا، اپنے کام میں اس کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی پر دھیان دیا۔۔۔ اور سوچا، تم ہم میں سے تو نہیں ہو۔ اس لمحے اپنے ساتھی کے مقابلے میں میں نے خود کو فلپائنی ڈرائیور کے زیادہ قریب محسوس کیا؛ مجھے لگا کہ میں کسی ڈرامے کا کردار ہوں، اصل زندگی میں تو اس وقت میرا رخ گھر کی طرف ہونا چاہیے تھا، جیسے باہر سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن ان واقعات نے، بلکہ در حقیقت انہیں کیفیات کہنا زیادہ مناسب ہو گا، میری ذہنی حالت بہت عجیب کر دی تھی۔ اس حد تک کہ اس رات مجھے بمشکل ہی نیند آ سکی۔ خوش قسمتی سے ہمارے اسائنمنٹ کی مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے مزید تجگوں کی مہلت نہ مل سکی؛ اگلے دن میری آفس سے اپنے ہوٹل کے کمرے میں رات دو بجے واپسی ہوئی اور بیڈ پر گرتے ہی مجھے بچوں کی سی نیند نے آ لیا۔

منیلا میں اپنے قیام کے دوران۔۔۔ میری یہاں آمد اخیر جولائی میں ہوئی تھی اور واپسی ستمبر کے وسط میں۔۔۔ میرا لاہور اپنی فیملی سے ہفتہ واری فون کالز کے ذریعے رابطہ رہا تھا جبکہ نیویارک میں ایریکا سے آن لائن بات ہوا کرتی تھی۔ وقت کے فرق کی وجہ سے اس کی صبح کے وقت بھیجی ہوئی ای میلز مجھے شام میں ملا کرتی تھیں اور میں

سونے سے قبل انہیں پڑھ کر جواب دے دیا کرتا تھا۔ اس کے پیغام مختصر ہوتے تھے، کبھی اس نے ایک یا دو پیراگراف سے زیادہ کی میل نہیں بھیجی، مگر اسے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہہ دینے کا ہنر آتا تھا۔ مثلاً ایک میسج اس طرح کا تھا۔ "چنگیز۔۔۔ میں ہیمپٹنز میں ہوں۔ آج ہم کچھ دوست ساحل کی سیر کو نکلے تھے اور میں اکیلے ذرا زیادہ آگے بڑھ گئی تھی۔ مجھے ایک چھوٹا سا تالاب ملا، پتھروں سے بھرا ہوا۔ مجھے اس طرح کے تالاب بے انتہا اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں کیسے لگتے ہیں؟ یہ اپنی ذات میں ایک مختصر سی دنیا ہوتے ہیں۔ محصور، شفاف اور ہر اعتبار سے مکمل۔ جیسے وقت ان تک آ کر منجمد ہو گیا ہو۔ بس کبھی کبھی سمندر کی ایک بڑی لہر آ کر اس دنیا میں ہلچل مچا دیتی ہے مگر کچھ ہی دیر بعد یہ پھر سے پہلے جیسے ہو جاتے ہیں، بس پانی میں کچھ نئی مچھلیاں بڑھ جاتی ہیں۔ بہر حال، جب میں واپس لوٹی تو سب پوچھنے لگے کہ میں کہاں تھی، تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے پوری دوپہر وہیں گزار دی تھی۔ بڑا خوابناک سا تھا وہ سب، اور اس کے بیچ میں نے تمہیں بھی یاد کیا تھا۔۔۔ ایریکا۔"

ایسے میسجز میری ہمت کو کئی روز تک بڑھائے رکھنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ شاید تمہیں لگ رہا ہو کہ میں اپنی کیفیات بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہوں۔ لیکن تمہیں سمجھنا ہو گا کہ لاہور میں، کم از کم اس وقت تک جب میں سیکنڈری اسکول میں ہوا کرتا تھا۔۔۔ ساری دنیا کی طرح یہاں بھی اب نوعمر لڑکے لڑکیوں کو نسبتاً زیادہ آزادیاں حاصل ہیں۔۔۔ ایسے تعلقات کی زیادہ سے زیادہ حد مختصر فون کالز، دوستوں کے ذریعے پیغامات اور ملنے کے ایسے وعدے ہوتے تھے جن کے پورے ہونے کا امکان صفر کے قریب ہوتا تھا۔ والدین کی اکثریت ان معاملات میں بہت سخت تھی، چنانچہ جن لڑکیوں کو ہم اپنی محبوبہ کا درجہ دیتے تھے ان سے ہماری کبھی کبھی ہفتوں ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ ان حالات میں ہم نے ہجر سے لذت کشید کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔۔ وہ لذت جس سے امریکی قطعی نابلد ہیں!۔۔۔

اس لیے میرا حوصلہ افزا قسم کی ای میلز وصول کر کے بہت خوش ہو جانا کوئی زیادہ اچنبھے کی بات نہ تھی۔

لیکن بہر حال مجھے ایریکا سے ملنے کی بھی شدید خواہش تھی اس لیے ہمارے پراجیکٹ کے اختتامی ایام میں بھی میرے جوش و جذبے میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہو گیا تھا۔ جم، جو ہمارے برآمد کیے ہوئے نتائج دیکھنے کے لیے آیا ہوا تھا، ایک دن مجھے ہوٹل میں لے کر بیٹھ گیا۔ "ہاں بھئی چنگیز،" اس نے ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ "سمجھ میں آ رہا ہے یہ سب؟" "بہت اچھی طرح جناب۔" میں نے جواب دیا۔ "سب کی رائے تمہارے متعلق بہت زبردست ہے۔" اس نے میرا ردعمل دیکھنے کے لیے توقف کیا، پھر مجھے مسکراتے دیکھ کر کہنے لگا "سوائے اس کے کہ تم بہت زیادہ محنت کر رہے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی صحت ہی بگاڑ لو۔" "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں سر۔" میں نے کہا۔ "میں حسبِ ضرورت آرام بھی کرتا ہوں۔" اس نے بھنویں اچکائیں اور ہنسنا شروع کر دیا۔ "تمہیں پتہ ہے، تم مجھے بہت پسند ہو۔ سچ مچ بہت پسند ہو۔ ویسے نہیں کہہ رہا جیسے کسی جونیئر کا مورال بلند کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے۔ تم واقعی ایک شارک ہو۔ اور یہی نام مجھے دیا گیا تھا جب میں نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ شارک۔ میں نے کبھی تیرنا نہیں چھوڑا۔ اور مجھ میں اتنی ہوشیاری تھی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ میں خود کو اس دنیا سے الگ تھلگ محسوس کرتا ہوں۔ یہی خوبیاں تم میں بھی ہیں۔"

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ جم نے مجھ سے اس انداز میں بات کی ہو اور مجھے سمجھ نہ آ رہا ہو کہ اسے کیا جواب دوں۔ ایک ایسا اعتراف جو سننے والے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے۔۔ جیسے ہم کرکٹ میں کہتے ہیں۔۔۔ ایسی گیند کی مانند ہوتا ہے جس کھیلنا انتہائی دشوار ہو۔ انکار کرنے کا مطلب یہ کہ آپ معترف کو جھٹلا رہے ہیں اور اقرار کریں تو یہ اپنی خامی تسلیم کرنے کے ہم معنی ہوا۔ لہذا میں نے بہت احتیاط سے پوچھا۔ "آپ خود کو الگ تھلگ کیوں محسوس کرتے تھے؟"۔

وہ پھر مسکرایا۔۔ یوں جیسے مجھے آر پار دیکھ سکتا ہو۔۔۔ پھر بولا۔ "کیونکہ میری پرورش کسی اور دنیا میں ہوئی تھی۔ میری آدھی زندگی ایسے بچے کے طور پر گزری تھی جو ٹافیوں کی دکان کو صرف باہر سے کھڑے ہو کر دیکھ سکتا ہو۔ اور امریکا میں، چاہے آپ کتنے ہی غریب کیوں نہ ہو، ٹی وی کے ذریعے آپ کو بہت اچھا نظارہ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ لیکن ہم بدترین حد تک غریب تھے۔ میرے والد کی وفات گینگرین کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اور قسمت کی ستم ظریفی کہ مجھے خوشبودار انگور کے پانی پر سینکڑوں ڈالر لٹانے کا موقع میسر ہے۔ غالباً تم میری بات سمجھ رہے ہو۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میری پرورش غربت میں نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بہر حال میرے بچپن اور لڑکپن سے ایک احساس محرومی ضرور وابستہ تھا، ان چیزوں کا نہیں جو ہمیں کبھی میسر نہیں رہی تھیں بلکہ ان کا جو ایک وقت میں ہمارے پاس تھیں اور آگے چل کر نہیں رہی تھیں۔ میں نے اپنے کچھ رشتہ داروں کو ایسی تصوراتی دنیا میں مگن دیکھا تھا جیسی بے گھر لوگ لاٹری کا ٹکٹ لے کر سجا لیتے ہیں۔ ناسٹلجیا ان کے لیے نشہ آور دوا کی طرح تھا، اور میرا بچپن اس نشے کے مضر اثرات کا مشاہدہ کرتے گزرا تھا: قرضے جن کی واپسی ممکن نہیں تھی، میراث کے پیچھے لڑائی جھگڑے، یہاں تک کہ شراب کا عادی ہو جانا اور اکا دکا خودکشیاں بھی۔ اس طرح میں اور جم واقعی ایک جیسے تھے: وہ ٹافیوں کی دکان کے باہر بڑا ہوا تھا اور میں اس کے دروازے پر، ایسے میں جبکہ دکان بند ہو رہی تھی۔

پھر ٹیم کے دوسرے ممبرز بھی باری باری ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے، لیکن جم جس انداز میں اپنا بازو میری کرسی کی پشت پر رکھے رہا، مجھے واقعتاً ایسا لگا جیسے اس نے مجھے اپنے پروں کی چھاؤں میں لیا ہوا ہو۔ وہ ایک بہت عمدہ احساس تھا، اور اس میں مزید اضافہ تب ہوا جب میں

نے ہوٹل اسٹاف کو جم کو خاص الخاص فرد سمجھ کر اس پر سب سے زیادہ توجہ دیتے دیکھا۔ میں اپنے گروپ میں واحد غیر امریکی تھا، پر مجھے لگ رہا تھا کہ میری پاکستانیت میرے سوٹ، میرے ایکسپنس اکاؤنٹ اور بالخصوص میرے ساتھیوں کی وجہ سے چھپ گئی ہے۔

اور اس سب کے باوجود۔۔۔۔۔ نہیں، یہاں مجھے ٹھہر کر تمہیں خبردار کر دینا چاہیے کہ آگے میں جو کچھ بتانے لگا ہوں وہ سن کر تمہیں اچھا محسوس نہیں ہو گا۔ ساتھ یہ بھی ہے کہ میرا گلا بالکل خشک ہو گیا ہے؛ ہوا جیسے بالکل ٹھہر گئی ہے اور رات اچھی خاصی اترنے کے باوجود اب بھی موسم گرم ہے۔ کیا تمہارے لیے بھی ایک اور سوفٹ ڈرنگ منگواؤں؟ نہیں؟ تمہیں مزید جاننے کا تجسس ہے اور تم چاہتے ہو کہ میں اپنی بات جاری رکھوں؟ ٹھیک ہے۔ میں ویٹر سے صرف اپنے لیے ایک بوتل منگوا لیتا ہوں؛ لو کہہ دیا۔ اور یہ لو وہ فنافٹ لے بھی آیا؛ ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم یہاں اس کے واحد گاہک ہیں! واہ، مزہ آ گیا۔ اس وقت مجھے اس کی سخت ضرورت تھی۔

اگلی شام متوقع طور پر منیلا میں ہمارے لیے آخری تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں پیکنگ کرتے ہوئے ٹی وی کھولا اور جو کچھ دیکھنے کو ملا، پہلی نظر میں وہ مجھے کسی فلم کا منظر لگا۔ لیکن دیکھتے دیکھتے اندازہ ہوا کہ یہ فکشن نہیں بلکہ خبریں چل رہی ہیں۔ میرے سامنے نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا پہلے ایک، اور پھر دوسرا ٹاور بھی زمیں بوس ہو گئے۔ اور یہ منظر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ہاں، چاہے سننے میں یہ کتنا ہی شرمناک محسوس ہوتا ہو، میرا ابتدائی ردعمل بے انتہا خوشی لیے ہوئے تھا۔

تمہارا غم و غصہ صاف ظاہر ہے، تمہارے بڑے بڑے ہاتھ، غالباً لاشعوری طور پر ہی، مٹھی کی صورت بھنچ گئے ہیں۔ مگر پلیز میرا یقین کرو کہ میں کوئی اذیت پسند جنونی نہیں ہوں، نہ ہی دوسروں کی تکلیف پر لاپرواہی میری فطرت ہے۔ جب مجھے کسی جاننے والے کے کسی شدید مرض میں مبتلا ہونے کا علم ہوتا ہے تو میں بے حد رنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ اگر مجھ سے کسی کارِ خیر کے لیے چندہ مانگا جاتا ہے تو میں اپنی استعداد کے مطابق بھرپور حصہ لیتا ہوں۔ لہٰذا اس المیے پر جس میں ہزاروں افراد کی جان گئی، اپنی خوشی کے متعلق تمہیں بتاتے ہوئے بھی مجھے اندر سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔

مگر اُس لمحے میرا ذہن حملوں کے متاثرین کی طرف نہیں گیا تھا۔۔۔ ٹیلیویژن پر تو اگر کسی ڈرامے میں میرے پسندیدہ کردار کی موت دکھا دی جائے تو میں رنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ نہیں، میری ساری توجہ اس معاملے کے علامتی پہلو پر مرکوز تھی، اس بات پر کہ بالآخر کسی نے امریکا کو گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیا۔ آہ، میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہارے غصے اور ناپسندیدگی میں مزید اضافہ کر رہا ہوں۔ مجھے یقیناً اندازہ ہے کہ اپنے ملک پر بیتی افتاد پر کسی دوسرے شخص کی جانب سے خوشی کا اظہار کتنا قابلِ نفرت ہو سکتا ہے۔ لیکن تم خود کو بھی تو اس حوالے سے معصوم قرار نہیں دے سکتے۔ کیا تمہیں ان ویڈیوز کو دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی جن میں امریکی افواج دشمنوں کے گھر بار کو پل بھر میں کھنڈرات میں بدلتی نظر آتی ہیں؟

مگر تمہارا کہنا ہے کہ تم لوگ حالتِ جنگ میں ہو۔ ٹھیک، تمہاری بات درست ہے۔ میں امریکا سے حالتِ جنگ میں نہیں تھا۔ اس کے برعکس میں نے وہیں سے تعلیم حاصل کی تھی اور ایک شاندار امریکی تنخواہ کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ایک امریکی لڑکی کے عشق میں بھی مبتلا تھا۔ تو پھر کیوں میری ذات کا ایک حصہ امریکا کو نقصان پہنچتے دیکھنا چاہتا تھا؟ مجھے تب اس کا علم نہیں تھا، صرف یہ پتہ تھا کہ اپنی اس سوچ کو اپنی ساتھیوں سے ہر حال میں چھپانا ہے کیوں کہ یہ ان کے لیے کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جب میری ٹیم اُس شام جم کے کمرے میں جمع ہوئی تو میں نے بھی اسی صدمے اور روحانی اذیت کا اظہار کیا جو باقیوں کے چہروں سے برس رہی تھی۔

لیکن جب میں نے انہیں اپنے پیاروں کے متعلق بات کرتے سنا تو میرا دھیان بھی ایریکا کی طرف چلا گیا اور پھر مجھے کسی بناوٹ کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ اموات صرف اتنے ہی علاقے میں ہوئی ہیں جس کا نام بعد میں گراؤنڈ زیرو پڑا اور یہ کہ حملوں سے پہلے ایریکا بخیریت گھر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے میں بھی اپنے ساتھیوں کی طرح بے حد متردد ہو گیا اور کچھ وقت کے لیے اپنے ابتدائی مسرت انگیز ردعمل کو بھول بھال گیا۔

ہم اگلے کئی روز تک منیلا سے نہیں نکل سکے کیوں کہ ساری فلائٹس کینسل ہو گئی تھیں۔ پھر جب نکلنے کا موقع آیا تو ائرپورٹ پر مجھے مسلح گارڈز ایک کمرے میں لے گئے جہاں سارے کپڑے اتروا کر میری تلاشی لی گئی۔ جہاز میں داخل ہونے پر مجھے دیکھ کر بہت سے مسافروں کے چہرے تشویش زدہ ہو گئے۔ نیویارک تک کا سفر میں نے اس انتہائی تکلیف دہ خیال کے ساتھ کیا کہ مجھے مشکوک سمجھا جا رہا ہے۔ یقیناً اس کے اثرات میرے چہرے پر بھی ظاہر ہوئے ہوں گے۔ جم نے جو میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا، دورانِ سفر کئی بار میری حالت کے پیشِ نظر میری خیریت دریافت کی۔

نیویارک پہنچنے پر مجھے میری ٹیم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ باقی سب امریکی شہریوں کی قطار میں لگ گئے جب کہ مجھے غیر ملکیوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑا۔ میرے پاسپورٹ کی چھان بین کرنے والی ایک بھاری بھرکم عورت تھی جس نے ہولسٹر میں پستول لٹکا رکھا تھا۔

"آپ کی امریکا آمد کا کیا مقصد ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔"میں یہیں رہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔"میں یہ نہیں پوچھ رہی۔ آپ سے امریکا آنے کا مقصد پوچھ رہی ہوں۔" ہماری گفتگو اسی انداز میں کئی منٹ تک چلتی رہی۔ اگلے مرحلے میں مجھے مزید تفتیش کے لیے ایک کمرے میں بھیج دیا گیا جہاں میں کافی دیر ایک دھاتی بینچ پر بہت عجیب حلیے والے شخص کے ساتھ بیٹھا رہا جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ میری ٹیم نے میرا انتظار نہیں کیا؛ جب میں کسٹم ہال پہنچا تو وہ اپنے سوٹ کیس لے کر جا چکے تھے۔ نتیجے میں مجھے مین ہٹن کے لیے بالکل تنہا روانہ ہونا پڑا۔

پر تم کیوں دانت پیس رہے ہو؟ اوہ اچھا، چمگادڑیں۔ ہاں یہ اب کافی نیچے آگئی ہیں۔ مگر یہ ہمیں چھوئیں گی نہیں، میں اس کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ تمہارا کہنا ہے کہ تمہیں معلوم ہے۔ تمہارا لہجہ کرخت ہے، مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہیں غصہ دلا دیا ہے، لیکن یہ بھی اندازہ ہے کہ یہ سب جان کر تمہیں کچھ خاص حیرانی نہیں ہوئی ہے۔ کیا تم اس کا انکار کرو گے؟ نہیں نا۔ اور کیا اس بات کے تناظر میں مجھے سمجھ لینا چاہیے کہ تم میرے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہو، حالانکہ ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟ شاید تم نے میرے ظاہری حلیے، خاص کر اس گھنی داڑھی کی وجہ سے کچھ اندازے قائم کر لیے ہیں۔ شاید تم نے ایک ماہر نشانے باز کی طرح میری کہانی کی اٹھان سے اس کی پوری پرواز کو جانچ لیا ہے یا پھر شاید۔۔۔ بس چھوڑو، بہت اندازے لگا لیے میں نے۔ چلو مینو پر توجہ دیتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ڈھیر ساری باتیں کرتے کرتے میں حق میزبانی کی ادائیگی کو بھول رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں تمہارے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں، تمہارا لاہور کیسے آنا ہوا، تم کس کمپنی کے لیے کام کرتے ہو، وغیرہ وغیرہ۔ رات اچھی خاصی اتر آئی ہے، اور اس مارکیٹ کی روشنیوں کے باوجود تمہارا چہرہ بڑی حد تک اندھیرے میں ہے۔ تو اب جبکہ ہماری آنکھیں دن کی طرح واضح نہیں دیکھ سکتیں، آؤ ہم بھی ان چمگادڑوں کی طرح اپنی دوسری حسیات کو کام میں لانا شروع کریں۔ ضرور تمہارے کان تھک چکے ہوں گے؛ وقت آگیا ہے کہ تم اپنی زبان کو بھی زحمت دو۔۔۔ فی الوقت کم از کم چکھنے کے لیے ہی، اگرچہ مجھے امید ہے کہ تمہیں بولنے پر بھی راضی کیا جا سکتا ہے!

زندگی کے موڑ پر

از کائنات بشیر

زندگی ایک ایسا اسٹیج ہے جس کی سیڑھی پر بہت دھیان سے پاؤں رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیدھی راہ چلتے چلتے اچانک کوئی موڑ سامنے آجاتا ہے۔ لیکن مڑتے ہی آگے ناکامی کی کھائی ہے یا کامیابی کی سیڑھی، اس کا پتہ نہیں چل پاتا۔ یہاں زندگی آپ کو قلابازی بھی کھلا سکتی ہے اور کامیابی کے لڈو بھی، لیکن ایسے موڑ زندگی میں آتے ضرور ہیں۔

اور زندگی میں اچھے دن بھی آتے ہیں اور برے دن بھی۔ خوش بختی اپنا دامن پھیلاتی ہے تو بد بختی بھی چلی آتی ہے، جب ہر چیز الٹ پلٹ ہونے لگتی ہے اور نروس بریک ڈاؤن جیسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی خود کو بے بس سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ آج کی مشکل اور تیز رفتار زندگی میں اس قسم کی باتیں اب غیر معمولی نہیں رہیں۔ اور تقریباً سبھی کو ہی مشکل اور ناپسندیدہ حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جو بندے کو حواس باختہ کر دیتے ہے، ذہن بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔ اک بے بسی اور لاچاری کی کیفیت ہو جاتی ہے، اپنی صلاحیتوں پر گمان ہونے لگتا ہے۔

لیکن مہاتما بدھ نے مشکل اور دکھ کو زندگی کی بنیادی حقیقت قرار دیا تھا۔

اور مرزا غالب نے اس بارے کہا تھا کہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہم میں سے کوئی بھی تو ایسا نہیں ہے جو اپنی زندگی کے آخر تک بغیر دکھ تکالیف اٹھائے سفر کر سکتا ہے۔ اور ہزار جتن کے باوجود اپنی لامحدود خواہشات پوری کر پاتا ہو، کبھی معاشی دکھ گھیر لیتے ہیں، کسی وقت وسائل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی یہ لڑائی کبھی انفرادی طور پر لڑتے ہیں اور کبھی اجتماعی طور پر۔ چھوٹا موٹا دکھ ہو تو اپنی ذات پر لے لیتے ہیں بڑا ہو تو باقیوں کو بھی ساتھ سفر کراتے ہیں۔ پر ہر منزل میں کوئی نہ کوئی کانٹا ضرور چھپا ہوتا ہے۔

تو اب اس کا سدِباب کیسے کیا جائے، ہنس کر کیا جائے یا رو کر یا واویلا مچا کر کیا جائے۔ اب یہ سب کا انفرادی معاملہ ہے۔ کچھ مہربان مشکل کی ان گھڑیوں کو زندگی کی حقیقت سمجھ کر ایک ٹھوکر سے سائیڈ پر کر دیں گے اور آگے بڑھ جائیں گے۔ پر کچھ دل نادان و ناتواں ٹھٹک کر وہیں کھڑے ہو جائیں گے اور یہ مصیبت کی گھڑی ایک پہاڑ کی طرح ان کا راستہ روک لے گی۔

مگر گھبرائیے مت مصیبت کی اس گھڑی میں آپ اکیلے نہیں ہیں۔ بعض دفعہ ہمیں انہیں اجتماعی طور پر بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی سماجی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے معاشرتی، قومی یا مذہبی بھی۔ اور پھر اس کے اندر پوری قوم شامل ہو جاتی ہے اور پھر یہ دکھ، درد صرف انسانوں پر ہی حملہ نہیں کرتے ہیں۔ یہ تو قوموں کے ساتھ ساتھ مذاہب پر بھی اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ اس زاویے کی گہرائی میں بہت سی دلچسپ معلومات سامنے آئیں۔ جیسے

بدھ مذہب میں ہے کہ

"اگر برا ہوتا ہے تو یہ واقعی برا نہیں ہوتا ہے۔"

ہاں، کہا جا سکتا ہے۔ دل کے بہلانے کو واقعی یہ خیال اچھا ہے۔ اگر اس طرح سوچا جائے تو تکلیف کی اذیت ختم ہو جائے گی۔ اور مشکل کا آنا بھی برا نہیں لگے گا اور سہنا بھی۔

ہندو مذہب کا اس طرح تکلیف مصیبت آنے بارے یہ سوچ ہے کہ

"اس سے پہلے بھی برا ہو چکا ہے۔"

واہ واہ کیا کہنے، مطلب کہ یہ کون سی اب نئی بات ہے۔ اب تک تو عادی ہو جانا چاہیئے۔

یہودی مذہب کے مطابق وہ اس برا ہونے کو اس طرح لیتے ہیں کہ

"یہ برا ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے۔"

ہاں واقعی یہ گھمبیر بات ہے کہ ہم ہی کیوں؟ آخر ہم نے کیا بگاڑا ہے۔

اور کیتھولک مذہب والے کہتے ہیں کہ "برا ہوتا ہے کیونکہ تم اسے ڈیزرو کرتے ہو۔"

یہ واقعی خود کو کٹہرے میں کھڑا کرنے والی بات ہے۔

اسلام کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ

" اگر برا ہوتا ہے تو یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔"

بالکل درست کہا۔ یہی ہمارا ایمان ہے۔

آخر میں یہی کہوں گی کہ یہ زندگی تو اک امتحان ہے۔ جس کا پرچہ حل کرنے کے لیے قلم ہاتھ میں لے کر ہر وقت الرٹ رہنا پڑتا ہے تو اس بات کے لیے بھی تیار رہیئے نا کہ کبھی نمبر زیادہ آئیں گے اور کبھی کم۔

حِلم

نوشیرواں نے اپنے وزیر بزرجمہر سے پوچھا کہ حِلم کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ حِلم اخلاق کے دسترخوان کا نمک ہے۔ چنانچہ اس کے حرفوں کو الٹ دیا جائے تو ملح ہو جاتا ہے۔ (جس کے معنی نمک کے ہیں)۔ جس طرح کوئی کھانا بغیر نمک کے مزیدار نہیں ہوتا، اسی طرح کوئی خلق بغیر حِلم کے زیب نہیں دیتا۔

(اخلاقِ محسنی)

چیخ

رافعہ خان

وہ عورتوں والے کمرے کے دروازے پر لاپرواہی سے لٹکایا موٹا ایک پینل کا پردہ اٹھا کر باہر نکلی۔ چھوٹے سے کمرے کے باہر بنی تنگ راہداری کے بیچوں بیچ جوتوں کا ڈھیر لگا تھا۔ دائیں جانب مردوں کے کمرے کا آدھا کھلا دروازہ وہاں ناکافی روشنی پھیلا رہا تھا۔ باہر کو کھلتی بڑی کھڑکی سے اوٹ کرنے کے خیال سے روشنی نہیں کی گئی تھی۔ سامنے کی جانب بیت الخلاء تھا۔ جو مشترکہ تھا۔ چیخ کی آواز وہیں سے آرہی تھیں۔ طویل، بے معانی اور ضدی۔ اس کے سامنے ہی وہ نکلا۔

وہ میں۔۔ مجھے معلوم۔۔ یہاں کوئی ہے۔۔

اس کی آنکھوں کے چیختے سوال سن کر وہ بے ربط ہو گیا۔ جھپٹ کر سامنے بنے مردانے کے دروازے میں گھسا، پناہ کے لیے۔ پر وہ جانتی تھی شام کے اس لمحے کی خاموشی میں دیر تک گونجتی اس چیخ نے اس چھوٹی سی عمارت کے دونوں کمروں میں جو سوال اگائے ہیں وہ اسے دیر تک بے ربط رکھنے والے تھے۔ وہ مسکرائی۔

بیت الخلاء میں وہ نیچے جھک بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے، اس کا چھوٹا سا ہاتھ تھام کر مدھر پیار کی ساری نرمی لہجے میں گھول دی۔

کیا ہوا تھا؟

وہ یہاں آگیا تھا۔

دروازہ بند تھا؟

لاک نہیں ہوا۔

پھر؟

میں یہاں تھی۔ پھر بھی ہاتھ دھوتا رہا

بری بات ہوئی نا

بری بات۔ ہاں پر وہ بہت چھوٹی تھی۔ اور اس کے ساتھ دوسری اور بھی زیادہ۔ سکول سے گھر تک کا وہ راستہ بہت طویل۔۔ چلتے چلتے وہ کتنی بار تھمیں۔

اب بس اور نہیں چلا جارہا۔

ہاں ابھی بس آئے گی۔

اب آئی تو ہم بھی لٹک جائیں گے۔

میرا ہاتھ نہیں چھوڑنا بس۔

ٹھیک ہے نہیں چھوڑوں گی۔

ہمت نہیں تھی لیکن چھوٹی کا تھکن زدہ چہرہ دیکھ کر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ ہر پانچ منٹ میں ایک بس آتی۔ عورتوں کا چھوٹا حصہ ہمیشہ کی طرح کھچا کھچ بھرا تھا۔ اور دروازے پر کالج کے بے فکرے۔ اور اس مرتبہ وہ سب سے آگے تھی۔ لیکن آخری وہ ہی رہ گئی۔

آؤ آؤ چھوٹی آپی

اوے چھوٹی آپی کو چڑھنے دو اوے

ان سب کے مسکراتے چہرے۔ باہر نہیں گرنے دیں گے۔ اس نے اجنبی تحفظ کو ایک چہرہ دیا۔

وہ چڑھی تو چھوٹی کے ساتھ ہی تھی۔ پر اسے خود سے آگے رکھتے نہ جانے کیسے وہ چاروں اور سے گھر گئی تھی۔

بس ایک ہاتھ میں وہ چھوٹا سا ہاتھ تھا

اسے معلوم تھا وہ ہاتھ اسے نہیں چھوڑنا تھا۔

دوسرا ہاتھ اس کا دفاع تھا۔

بس کے دروازے میں مرد اور عورت کی تخصیص کرتے اس جنگلے میں گڑے وہ ان دیوزادوں سے لڑتی رہی۔ اور اس نے دھوکے کے تصور کو ایک چہرہ دیا تھا۔

بس ایک سٹاپ۔ بس ایک سٹاپ

بس چند لمحے اور۔

اس سٹاپ پر اترنا ہے

اس کی آواز کبھی چیخ نہیں بنی تھی۔ مگر اس نے چیخنے کی کوشش ضرور کی۔ اپنی اس کوشش کو اس نے ایک چہرہ دیا تھا۔

نہیں ابھی نہیں۔ چھوٹی چلائی۔ اور نہیں چلنا

نہیں ابھی۔

اب اس کو چھوٹی کی تھکن پرواہ نہیں تھی۔

اسے لمبے راستے کی پرواہ بھی نہیں تھی

اسے ان کی پرواہ تھی جنہیں ابھی معلوم نہیں تھا

بس اسے چیخنا نہیں آتا تھا۔ پھر اس اجنبی تحفظ کا چہرہ اس کی بے بس کوشش کے چہرے کے ساتھ تمام عمر دھوکے کے اس چہرے سے لڑتا رہا، کبھی جیتا نہیں۔ ہارتا رہا۔ مگر اس پل اس ضدی اونچی چیخ کو سن کر اسے لگا ایک جیت ہوئی ہے۔

بالکل بہت بری بات۔

اس چیخ کو سنبھال کر رکھنا۔

اور اگر کوئی بھی بری بات ہو ہمیشہ ایسے چیخنا۔

بالکل ایسے چیخو گی نا۔

تم بہت بہادر ہونا۔

اس نے چھوٹے چھوٹے دونوں ہاتھوں کو تھام کر لبوں سے لگایا۔ اس کا سر اثبات میں ہلا۔ اور چھوٹے سے سرخ چہرے میں ایک مسکراہٹ گھل گئی۔

☆---☆---☆

سوچ کا گرداب

کشتاج

کھڑکیوں کے شیشے چٹخنے کا شور تھا یا تیزی سے بڑھتی ہوئی حدت، جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کبھی وہ آنکھیں مل مل کے اپنے گھر کے مختلف حصوں کو جلتے دیکھتا تو کبھی خود کو بچانے کی فکر کرتا۔ اس کی آرام گاہ سے ملحقہ کمرے دھڑا دھڑ جل رہے تھے اگلی باری اس کے کمرے اور پھر خود اس کی تھی۔ اسے انتہائی خوف محسوس ہوا وہ فوراً تیزی سے بستر سے اٹھا لیکن بچاؤ کی جگہ تلاشنے کی بجائے اپنا کچھ قیمتی سامان بچانے کے لئے آگ لگے ہوئے حصوں کی طرف بھاگا۔ پھر ایک دم سے خود کو روکا کہ جان ہے تو جہان ہے اور پلٹ آیا۔ سارے گھر میں صرف اور صرف گھر کی اشیا کے جل جل کر گرنے چٹخنے کا شور مسلط تھا اور جھلسا دینے والی آگ اسی کا احاطہ کرنے کو تھی۔ اس کی آرام گاہ میں، کمرے میں داخل ہونے والے دروازے کے علاوہ ایک اور دروازہ بھی تھا جہاں پر ٹیرس بنا ہوا تھا۔ یہ گرل نما دروازہ چوروں سے حفاظت کے لئے اکثر لاک کر کے سونا پڑتا تھا۔ اب وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا اور ایک یہی راستہ نظر آرہا تھا۔

ٹیرس سے کودنے ہی والا تھا کہ ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا۔

لوگ کیا سوچیں گے، ایسے کود تا دیکھ کر چور تو نہیں سمجھ لیں گے۔ ایسی حالت میں بھی ذہن نے ایک الگ سی بات سوچی۔ پھر ایک اور خیال آیا۔

لیکن کون سے لوگ کہاں کے لوگ۔ جب میرا گھر جل رہا ہے تو بجھانے تک تو کوئی آیا ہی نہیں۔ لیکن پھر اس نے مزید غور کیا۔

یہ سب سوئے ہوئے کیوں ہیں۔۔۔۔۔؟ ان کا پڑوسی جل رہا ہے اور یہ سب سوئے پڑے ہیں۔ آخر کیوں اتنے اطمینان سے سو رہے ہیں۔ عجیب خوفناک سا منظر تھا جسے آنکھیں جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پیچھے آگ اور ادھر یہ۔ وہ کودنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک اور خیال آیا کہیں وہ یہ سب خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

نہیں یہ سب خواب نہیں ہو سکتا۔ میرا گھر جل رہا ہے میں دیکھ رہا ہوں۔

لیکن خواب بھی تو سچ ہی لگتا ہے نا۔

ہاں لگتا تو ہے لیکن خواب میں کب پتہ چلتا ہے کہ خواب دیکھا جا رہا ہے۔

اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان خواب دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسے پتہ بھی چل جاتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جن کے ساتھ ایسی بھی کیفیت ہو جایا کرتی ہیں۔ تب وہ کوشش کرتا ہے کہ اگر اچھا خواب ہے تو ختم ہی نہ ہو اور برا خواب ہے تو جلد سے جلد آنکھ کھل جائے۔

وہ اب خود کو جگانا چاہتا تھا۔

وہ خود کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر پھر وہ ایک دم بستر پر جا بیٹھا

کہ چلو آج دیکھ لیتے ہیں کہ خواب میں آگ کیسے لگتی ہے۔

وہ مطمئن تھا کہ خواب ہی ہے کچھ نہیں ہو گا تبھی تو اتنی دیدہ دلیری سے بستر پر بیٹھ گیا تھا، لیکن دل ڈر رہا تھا کہ کیا اتنا خوفناک منظر مجھ سے برداشت ہو جائے گا۔ نہیں شاید نہیں ہو گا۔۔۔۔ کچھ دیر ہی میں اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود کو جگا کر رہے گا کیوں کہ پہلے تو وہ خوش ہی تھا کہ وہ بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہے جن کو خواب ہی میں خواب کا علم ہو جاتا ہے لیکن بعد میں اس نے یہ سوچا کہ کیا موت کے بعد قبر و قیامت کے مناظر بھی دیکھنا پڑھیں گے۔

واعظوں کی قبر کے عذاب والی باتیں یاد آئیں اور خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

میں کل سے ایک نیک انسان بن جاؤں گا تا کہ جب اصل قیامت آئے تو مجھے یہ خوف نہ ہو۔۔ وہ بڑبڑایا۔

اب آگ کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ اور قریب کے پردے جلنے لگے تھے۔۔۔

وہ اپنے کمرے کو آگ کی لپیٹوں میں محسوس کر کے اندر تک کانپ گیا کہ جب میرا بدن بھی ان لپیٹوں میں ہو گا۔۔۔ تو۔۔۔۔ تو تو۔۔۔ کچھ نہیں ہو گا بس۔۔

آج یہ سب دیکھ لوں گا میں۔۔۔ اس نے خود کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔۔۔

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔۔ تارے چھٹ رہے تھے۔۔۔

اندھیری رات کہیں بڑھتی کہی کم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔۔

دھیرے دھیرے صبح ہو ہی گئی۔۔

صبح فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اس کے گھر کی آگ بجھا رہی تھیں اور ایمبولینس میں پڑی اس کی سوختہ لاش کی ادھ کھلی آنکھوں میں ابھی بھی یہی سوال رقم تھا کہ کیا یہ سب ایک خواب نہیں تھا۔۔۔۔

پر اس کا جواب پانے کے لیے دوبارہ سے جاگنا اس کے بس میں نہ رہا تھا۔۔۔۔

اقتباس

مستنصر حسین تارڑ کی کتاب "پیار کا پہلا شہر" سے

شہزادے کے نام

بدصورت لوگوں کو بھی محبت ایسے جذبے کی چاہت ہوتی ہے مگر ان کا دل اس بات کو نہیں مانتا کہ وہ صرف اس وجہ سے اس محبت سے محروم کر دیئے جائیں۔

پیرس کی پاسکل کی طرف سے پیار کے ساتھ!

مراسلہ : سارا

ایڈیڈز چوائس

کوما

آمنہ احمد

ہسپتال کے بستر پر لیٹی بظاہر وہ سوتی نظر آرہی ہے مگر وہ سب آوازیں سن رہی ہے اور اپنی نیم وا آنکھوں سے کمرے کا کچھ حصہ دیکھ بھی رہی ہے۔ اب سے کچھ دیر پہلے ڈاکٹر اسکے شوہر سے تفصیلی بات چیت کر کے گیا ہے جو کے کمرے سے باہر ہوئی۔ مگر کچھ حصہ اس نے بھی سن لیا کیونکہ نرس کمرے سے جاتے ہوئے دروازہ پوری طرح بند کرنا بھول گئی ہے۔

ڈاکٹر اسکے شوہر کو بتا رہا ہے کہ ایسے مریض کبھی کبھی دیکھ اور سن سکتے ہیں مگر نہ تو ہل سکتے ہیں نہ ہی بول۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر کا اسکے شوہر کو مشورہ تھا کہ وہ جس قدر ہو سکے اپنی بیوی کا خیال رکھے، زیادہ سے زیادہ وقت اسکے ساتھ گزارنے کی کوشش کرے، اور اسے اس بات کا یقین دلاتا رہے کہ وہ اسکے لئے بہت اہم ہے۔

آج اسکا شوہر ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے دو گھنٹے اسکا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا رہا ہے۔ اور وہ ہنس رہی ہے کہ دیکھا کیسا قابو کیا ہے۔ اسے تو ایک پل آرام سے بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ نیا ہوتے رہنا چاہئے۔ یہ جو وہ ہسپتال کے بستر پر ہے، یہ بھی تو اسکے شوہر کے ایک ایڈونچر کا نتیجہ ہے۔ وہ اسے کہنا چاہتی ہے کہ وہ بہت مزے میں ہے اور اسے گھر جا کر آرام کرنا چاہئے۔ مگر آواز سوچ کا ساتھ نہیں دے رہی ہے اور ہونٹوں تک آتے آتے گم ہو جاتی ہے۔ وہ اسکا ہاتھ دبا کر اسے اپنے ہونے کا یقین دلانا چاہتی ہے مگر لمس میں حدت نہیں۔ پھر وہ اسکے ساکت وجود اور نیم وا آنکھوں کو دیکھتے دیکھتے تھک کر خود ہی اٹھ گیا، یہ کہہ کر کہ وہ کچھ دیر میں آتا ہے۔

شام رات میں ڈھل رہی ہے۔ مہمانوں کے اوقات ختم ہونے کے بعد اب ہسپتال کے کاریڈور سنسان ہو چلے ہیں۔ سارے دن کی گہما گہمی کے بعد نرسز اور ڈاکٹرز بھی اب کچھ سکون سے ہیں۔ اسے بھی یہ خاموشی اچھی لگ رہی ہے۔ اب تو وہ ان مشینوں کی آواز کی بھی عادی ہو گئی ہے۔ گھر میں بھی جب وہ جاب پر چلا جاتا تھا تو وہ کافی کا مگ لے کر، ٹی وی بند کر کے لاؤنج کی کھڑکی میں آ کر بیٹھ جاتی تھی اور خاموشی سے لان کے سبزے کو تکا کرتی تھی۔

اب بھی وہ یہی کر رہی ہے۔ نرس کھڑکی کے پردے برابر کرنا بھول گئی ہے، مگر اسکا خیال ہے کہ وہ اسکے شوہر کی ہدایات کے نتیجے میں کھڑکی کے پردے برابر کیے بغیر چلی گئی ہے۔ "اسے میرا کتنا خیال ہے۔" اس نے سوچا۔ اور اب وہ کھڑکی پر جھکے درخت اور آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے اس دن کے بارے میں سوچ رہی ہے جب سال پہلے وہ ایک دوسرے سے پہلی بار ملے تھے۔ وہ مسکرانے لگی مگر اسکے ہونٹ کسی بھی تاثر سے عاری ہیں جس کا احساس اسے نہیں ہے۔ وہ بہت کچھ یاد کرتی اور سوچتی رہی، یہاں تک کے اسے اپنے ایکسیڈنٹ کا دن یاد آگیا۔ اس دن بھی اس نے جلدی جلدی تیار ہونے کا شور مچایا ہوا تھا۔ پھر وہ ڈرائیونگ بھی ریش کر رہا تھا ہمیشہ کی طرح اور پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے جھرجھری لی۔۔۔ اسکے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اسے اس کا بھی احساس نہیں ہے۔

☆---☆---☆

وہ ہسپتال سے نکل کر پیدل چلنے لگا۔ مہینہ پہلے یہ سب کچھ ایسا نہ تھا اور وہ دونوں بہت خوش تھے۔ "وہ اسکی ہر بات ماننے والی آئیڈیل بیوی تھی"، "نہیں، ہے"، اس نے گھبرا کر اپنی تصحیح کی۔ اس پر قنوطیت طاری ہونے لگی۔ چلتے چلتے وہ کافی دور نکل آیا اور اسے احساس بھی نہ ہوا۔ وہ حیران ہو گیا۔ یہ تو ٹیوب سٹیشن کا وہی ایگزٹ ہے جہاں اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت تیزی میں تھی۔ وہ بھی آفس سے گھر جا رہا تھا اور یہ ٹرین مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر سامنے ہی ٹرین کھڑی تھی۔ وہ تیزی سے کھلے دروازے سے کوچ کے اندر داخل ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اس تیزی میں اس کا چمکیلا سلور اور گلاس کا بنا سلیپر پلیٹ فارم پر رہ گیا۔

اسکی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "سنڈریلا" اس نے زیر لب کہا اور بڑھ کر سلیپر اٹھالیا تھا۔ وہ ٹرین کے بند ہوتے دروازے سے بمشکل دوسری کوچ میں چڑھ سکا۔ اسکے بعد آخری سٹیشن تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا سٹیشن کے انتظار میں۔ سٹیشن پر اسے ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ واحد لڑکی تھی جسکے پاؤں میں ایک سلیپر نہیں تھا۔ یہ انکی پہلی ملاقات تھی۔ چھ ماہ بعد انہوں نے شادی کر لی اور اس ایکسیڈنٹ تک وہ ایک مثالی زندگی گزار رہے تھے۔ "آہ! ہر فیری ٹیل کا انجام اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے نہیں ہوتا۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

وہ آتے جاتے لوگوں اور ٹرینوں کو بے مقصد دیکھتا رہا۔ ایک دم وہ چونک گیا۔ وہ بہت تیزی میں تھی ٹرین پر سوار ہونے کیلئے۔ اور اس تیزی میں اس کے ہاتھ سے ایک شاپنگ بیگ گر گیا۔ اس نے لاشعوری طور پر وہ بیگ اٹھالیا اور پچھلی کوچ میں چڑھ گیا۔ بیگ کھول کر دیکھا تو اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "اس بار گلاس اور سلور جوتوں کا جوڑا ہے۔" وہ اس بار بھی اطمینان سے بیٹھ گیا۔

☆---☆---☆

آج ڈاکٹر نے اسے پھر کہا تھا کہ فیصلہ اسکے ہاتھ میں ہے۔ چاہے تو وہ لائف سپورٹ ہٹا دے، چاہے تو رہنے دے، ویسے کچھ مریض اس سے لمبے عرصے بعد بھی کومے سے باہر نکل آتے ہیں۔ آج سے پہلے وہ ڈاکٹر کی رائے سے اختلاف کرتا آیا تھا۔ "اب اور نہیں" وہ دل میں مسکرایا۔ اس نے ڈاکٹر سے اجازت مانگی کہ وہ یہ کام خود کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر نے سر ہلا دیا۔ فاسٹر ہوم میں پلنے والی لڑکی کا تو باپ کیا سوتیلی ماں بھی نہیں۔ وہ ہنسا۔

☆---☆---☆

وہ آج بہت بے چین ہے۔ وہ بہت دنوں سے آیا نہیں، مگر آج اسے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا، اور وہ آگیا۔ اسکے ہاتھ میں سرخ

گلاب لایا تو اس نے ناراض ہو کر کہا تھا "میرے مرنے پر سرخ گلاب لانا"۔ "آج کیوں؟" اسکی آنکھیں پھیل گئی، جو اُس نے بھی دیکھیں۔ اس نے اسکو غور سے دیکھتے ہوئے گلاب اسکے سینے پر رکھ دیے۔

"تو کیا وہ ناامید ہو گیا"۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ "نہیں اتنی جلدی نہیں، دیکھو میری آنکھوں کی طرف، دیکھو میری انگلیاں ان گلابوں کو محسوس کر رہی ہیں"۔ اس نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے بولنے کی کوشش کی۔ "دیکھو پہلے میں تمھاری سنڈریلا تھی، اب میں سلیپنگ بیوٹی ہوں۔ تم میرے ماتھے پہ بوسہ تو دو، میں جی اٹھوں گی۔ دیکھو تو، تم میری آنکھوں میں دیکھو تو۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ آکسیجن ٹیوب کی طرف بڑھتے اسکے ہاتھ کو روکنا چاہ رہی ہے مگر روک نہ پائی۔

وہ اپنی آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشے محسوس کر رہی ہے۔

وہ اس پر جھکا اور سرگوشی میں بولا "تم پہلے میری سنڈریلا تھی، اب سلیپنگ بیوٹی ہو۔ الوداع میری سلیپنگ بیوٹی الوداع میری سنڈریلا۔ میں تمھارے ماتھے پہ بوسہ نہیں دوں گا کیونکہ مجھے تمہیں جگانا نہیں ہے۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔ اس نے آہستہ سے آکسیجن کی نالی نکال دی۔

ایک نئی سنڈریلا اسکی منتظر تھی۔

☆---☆---☆

اقتباس

مجھے افسوس ہے کہ آپ پانیوں کے سفر پر گامزن ہیں جہاں پیروں تلے سے زمین چھن جاتی ہے۔۔۔ اس سے پہلے کہ آپ ڈوب جائیں۔۔ میری گزارش ہے کہ اِن راہوں سے لوٹ آئیں۔۔ کیونکہ وہاں آپ کا عکس تو آپ کا ساتھ دے سکتا ہے مجھ جیسا انسان نہیں۔

(بے نام سایہ درد تحریر وش)

نیل کی نگری:

یہ اوائل دسمبر کی ایک دھندلکے میں بسی شام ہے۔ گو کہ سردی کی ابھی ابتداء ہی ہے مگر دریائے نیل کی سبک موجوں پر ہلکورے لیتی اس جہازی سائز کشتی کے ڈیک پر میں گرم شال کے باوجود ٹھٹھر رہی ہوں۔ روشنیوں سے سجی سنوری یہ کشتیاں خصوصاً سیاحوں کے لئے رقص و طعام کے ساتھ ساتھ نیل کے ساحل سے لگے قاہرہ کی روشنیوں کے مناظر سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ نیچے کی منزل میں فی الوقت پیٹ کی ٹھنڈک سے پہلے آنکھوں کی ٹھنڈک بہ معنی بیلی رقص کا سلسلہ جاری ہے لیکن میں، شہر قاہرہ کی دھندلکے میں بسی اس ٹھٹھرتی شام میں آس پاس کے منظر میں گم ہو کر اپنی ڈائری لکھ رہی ہوں کہ میرے لئے نیل کی سطح سے یہ خوابناک منظر دیکھنا، ایک تھرکتی عورت کو دیکھنے سے کئی گنا بہتر ہے۔

آج صبح طیران مصر کے طیارے سے جب میں قاہرہ لینڈ ہوئی تو بلندی سے میں نے جو دو مقامات سب سے پہلے دیکھے وہ تھے اہرام مصر اور دریائے نیل۔ گو اہرام مصر دیکھنا میرے دیرینہ خوابوں میں سے ایک ہے مگر بلندی سے صحرا کے بیچوں بیچ سورج کی روشنی میں جگمگاتا، قاہرہ شہر کو چیرتا یہ نیلگوں پانی میرے دل کے کونے میں ایک دم گھر کر گیا اور سب سے پہلے نیل ہی سیر کی لسٹ پر سر فہرست رہا۔ نیل کا بلاواسطہ تعلق چونکہ میرے اپنے ملک سے بھی ہے لہٰذا یہ انسیت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

یوں تو دریائے نیل کا گزر کئی ملکوں سے ہوتا ہوا مصر میں اختتام ہوتا ہے بلکہ حقیقت میں مجموعی دریائے نیل کا صرف بائیسواں حصہ ہی مصر میں واقع ہے مگر سرزمینِ مصر کو ہی خاص نیل کی نگری کہا جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس سرزمین پر خصوصاً نیل کے اطراف ہی دنیا کی سب سے قدیم تہذیب کی ابتداء ہوئی۔ سات ہزار برسوں پر پھیلی ہوئی یہ تہذیب کے دور عروج اور زوال میں بھی نیل کا نمایاں کردار رہا ہے۔ نیل کی روانی دوانی سے اس کی خوش حالی اور نیل کی خشکی سے اس تہذیب کا دورِ زوال وابستہ ہے۔

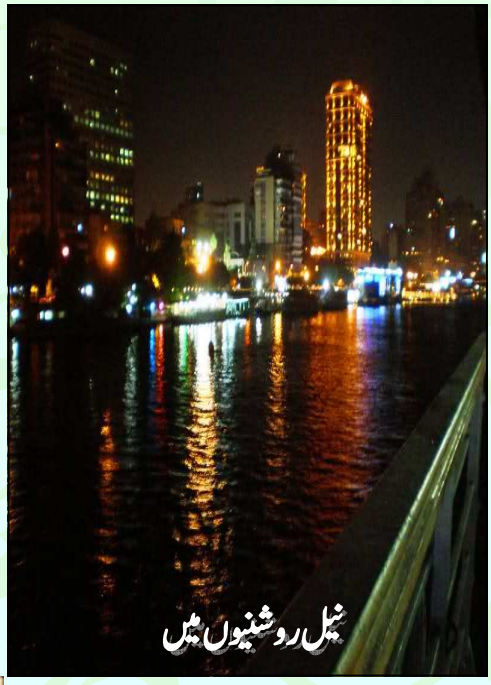

دریائے نیل کی ابتداء مشرقی افریقہ کی سب سے بڑی جھیل وکٹوریہ سے ہوتی ہے جو کہ شمالی تنزانیہ میں واقع ہے۔ یہ جھیل افریقہ کی سب سے بڑی جھیل بھی کہلاتی ہے۔ اس جھیل سے جو دریا نکلتا ہے وہ سفید نیل کہلاتا ہے۔ یہ دریا یوگینڈا سے ہوتا ہوا سوڈان میں داخل ہوتا ہے۔ خرتوم کے قریب یہ دریا ایتھوپیا سے آتے ہوئے دوسرے دریا بلو نیل سے مل جاتا ہے۔ ان دونوں دریاؤں کے ملن سے وہ دریائے نیل وجود میں آتا ہے جو مصر کے وسط سے گزرتا ہے۔

جب ذکر دریائے نیل اور مصر کا ہو تو ذہن فوراً موسٰی و فرعون پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ یہ وہی نیل ہے جس نے حضرت موسٰی علیہ السلام کے ننھے وجود کو پناہ دی اور وہیں پہنچا دیا جن کے ڈر سے مادر موسٰی علیہ السلام نے انہیں دریا میں ڈالا تھا اور وہ فرعون ہی کے گھر میں بی بی آسیہ کی آغوش میں پلے بڑھے۔ خدائی کا دعوٰی کرنے والا فرعون رات کے اندھیرے میں اپنے رب سے توبہ کرتا تھا اور نیل کی زندگی کے لئے نذرانے چڑھاتا تھا۔ یہ وہی مصر ہے جن کے بازار میں یوسف علیہ السلام غلاموں کی طرح بکے اور یہی مصر کے بادشاہ بھی بنے۔

مصریوں کی زندگی میں دریائے نیل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہزاروں سال سے مصر کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی نیل کے آس پاس ہی بستی ہے۔ اگر نیل نہ ہو تو مصر صرف ایک لق و دق صحرا ہے۔ اس صحرا میں زندگی کی واحد ضمانت دریائے نیل ہے۔ قدیم مصر کے خداؤں میں نیل کا ایک عدد خدا "ہاپی" بھی ہوا کرتا تھا جو کہ نیل کی حفاظت کرتا تھا۔ ایتھوپیا کے پہاڑوں میں بارشوں کے بعد نیل میں اٹھتا۔ سیلاب، مصر کے باشندوں کے لئے ایک خوش آئند بات تھی۔ سیلاب سے تر زمین مصریوں کے لئے نیل کے خدا کا تحفہ ہوتی۔ سیلاب اترنے کے بعد کی زرخیز زمین کو وہ کاشت کر کے اپنے اناج کا بندوبست کرتے۔ نیل

پر ہی کشتیاں شمال و جنوب کی طرف بحری سفر اور اندرونِ مصر تجارت کے سلسلے میں کارآمد ہوتیں۔

میں آسمان میں جابجا ٹمٹماتے تاروں کو دیکھ کر یہ سوچ رہی ہوں کہ ہاپی اس وقت کیا کر رہا ہو گا۔ کیا وہ اب بھی نیل کی حفاظت کر رہا ہے یا اسوان ڈیم کے بعد اس کی ڈیوٹی ختم۔

کشتی دریا کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں ڈیک کی ریلنگ سے ٹیک لگائے نیل کی گہرائیوں کا اندازہ لگانے کی کوشش میں ہوں۔ قدیم مصر سے اب تک یہ نیل مصریوں کی بقا کی ضمانت دیتا رہا ہے۔ جانے اس کے سینے میں کتنے راز دفن ہیں۔ اس وقت نیل کے کنارے قاہرہ کی فلک بوس عمارتوں کی روشنیوں میں جگمگا رہے ہیں۔ کئی ہزار سال پہلے اس نیل نے دو سلطنتوں کو یکجا ہوتے دیکھا جہاں سے قدیم مصر کی تہذیب کی ابتداء ہوتی ہے۔

اہرام مصر:

پیرامڈ اسٹریٹ کے ایک بلند و بالا ہوٹل کی سب سے بالائی منزل سے قاہرہ کے گرد و غبار میں ڈھکے یہ اہرام آج بھی اسی شان و شوکت سے کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے ساڑھے چار ہزار سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ بلندی سے جب میں نے ان پر نظر کی تھی، تو صحرا کے بیچ یہ مٹی کے چوپہل مینار نظر آئے تھے لیکن جب نزدیک گئے تو ایک خاص پیمائش سے کٹے دیوہیکل پتھروں کے مجموعے کو دیکھا۔ کئی ٹن وزنی لائم اسٹون کی کانوں سے لائے گئے یہ پتھر نیل

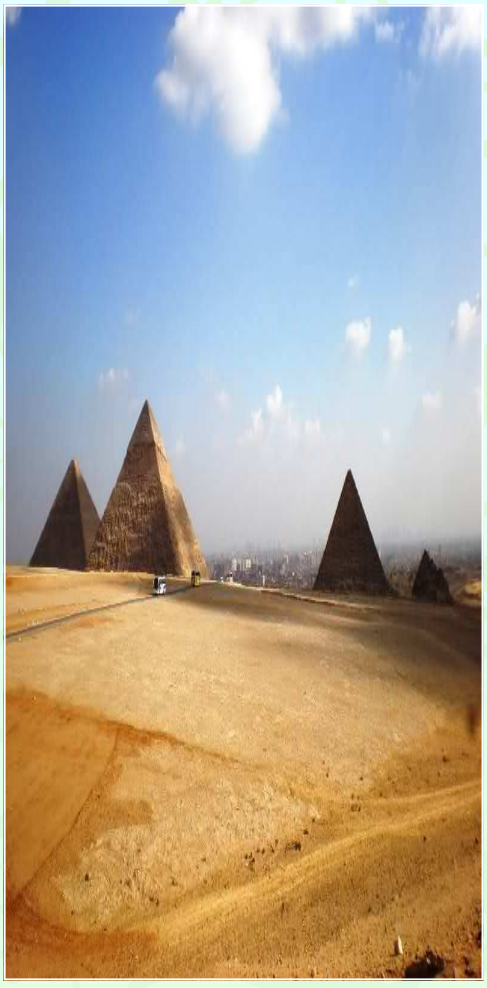

کے ذریعے دوسرے کنارے سے مقبرے کے لئے مختص کی ہوئی جگہ پر لے جائے جاتے تھے۔ پھر ان کی تراش خراش اور پالش کے بعد ایک ایک کر کے مینار کی بلندی تک لے جاتے تھے۔ کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ پندرہ ٹن کے پتھر کو اونچائی پر اٹھانا اس زمانے میں جس میں کوئی ہیوی ڈیوٹی مشینیں اور کرینیں نہیں تھیں۔ صرف انسانی اعضاء اور چند اوزاروں کے ساتھ، اپنے آپ میں خود ایک باکمال عجوبہ ہے۔ یہ عمل اسّی سال تک بیس تا پچیس ہزار نفوس کی جان توڑ محنت کے ساتھ برقرار رہا۔ تب جا کر دنیا کا سب سے بڑا پیرامڈ مکمل ہوا۔

زیادہ تر سیلاب کے زمانے میں ہی ان اہرام پر کام ہوتا رہا۔ سیلاب کے زمانوں میں ہی وہاں کے لوگ کاشتکاری کے علاوہ دوسرے کام کر سکتے تھے۔ چار ہزار سال پہلے سورج کی روشنی میں نہائے یہ دودھیا رنگت کے مقبرے کیا عظیم الشان منظر پیش کر رہے ہوں گے۔ آج حوادثِ زمانہ سے لائم کی سطح تو مجروح ہوئی ہے لیکن ان میں کبھی سوئے شہنشاہ کی آن بان اور ہیبت ان مقبروں کی فلک بوس بلندیوں میں نظر آتی ہے۔

گریٹ پیرامڈ قدیم مصر کے بادشاہ خوفو کا مقبرہ ہے جو کہ چوتھی ڈائنسٹی کا فرعون تھا۔ یہ مقبرہ لگ بھگ دو ہزار پانچ سو پچاس سال قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا ہے۔ مقبرہ اگر باہر سے عجوبہ ہے تو اندر سے تو یہ پورا عجائب گھر ہے۔ بھول بھلیوں کی طرح بچھی ہوئی سرنگیں، تنگ و تاریک اندھے راستے، بند گلیاں، چھوٹے بڑے حجرے جن کی دیواروں پر قدیم مصری زبان کے نقش و نگار کئے گئے ہیں۔ ان نقوش کا مقصد فرعون کی نعش کو شیطانوں سے دور رکھنا اور ابدی زندگی کے راستے کی نشانیاں بتانا ہے۔ کچھ نقش قدیم مصر کے خداؤں کے لئے بھی فرعون کی نعش تک پہنچنے کے لئے راستے کا کام انجام دیتے ہیں جن کے ذریعے فرعون کی روح اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو سکتی ہے۔ قدیم مصری زندگی بعد از موت کو بہت ترجیح دیتا تھا جس کے مطابق ایک فرعون، آسمان کا خدا ہوتا ہے اور سورج کے خدا کی حفاظت بھی اس کے کاموں میں ہوتی ہے لیکن جب اس کی موت ہوتی ہے تو وہ سارے مرے ہوئے لوگوں کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ موت کا خدا "انوبیس" فرعون کی روح کو لینے آتا ہے اور وہ سورج کی کرنوں کے ذریعے اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس سفر کے اختتام پر فرعون کو پھر سے اپنے جسم، اشیاء خوردونوش، روز مرہ سامان زندگی حتٰی کہ غلاموں تک کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہی سارے فراعین کو اپنے مال و اسباب کے ساتھ ہی دفن کیا جاتا تھا۔ اس کے جسم کو حنوط کیا جاتا تھا تاکہ ابدی زندگی تک وہ جسم سلامت رہے اور سفر کے اختتام پر وہ اس جسم کو پھر سے پہن سکے۔

ہر زمانے کا یہ رنگ ہوتا ہے کہ جہاں مال ہوتا ہے وہاں لوٹنے والے بھی ہوتے ہیں۔ قدیم مصر کے راہب اور نجومی جانتے تھے کہ روح کا یہ سفر صدیوں پر محیط ہو گا۔ تب تک فرعون کے مال و اسباب اور نعش کی حفاظت کے لئے ایسا سامان کیا جائے کہ جو چور لٹیروں سے بھی محفوظ رہے اور حوادث زمانہ سے بھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرعون کی روح کو پرواز اور اپنے صحیح مقام پر سفر کے تعین کے لئے بھی ایسی ہی کسی مخصوص جگہ کی ضرورت تھی۔ نتیجتاً ان اہرام کا وجود عمل میں آتا ہے۔ اب تک جتنی حنوط شدہ نعشیں اور خزانے سالم دریافت ہوئے ہیں ان کو محفوظ رکھنے میں صحرائی مٹی کا بھی بڑا عمل دخل نظر آتا ہے۔

اہرام کے اندر ویسے تو تین مدفن گاہ بنے ہوئے ہیں جن میں ایک زیر زمین ہے اور دو بالائی سطح پر بنائے گئے ہیں۔ تاہم سب سے بڑا اور اصل مدفن اہرام کے وسط میں واقع ہے جو کہ کنگ چیمبر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس چیمبر تک ایک وسیع و عریض عالی شان نقش و نگار سے مزین گیلری جاتی ہے۔ چیمبر کو گرینائٹ کی دیواروں سے بند کر دیا۔

دوسرا بڑا مقبرہ ایک سو چھتیس میٹر بلند خوفو کے بیٹے خیفر کا ہے۔ اس مقبرے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے مالک کا مجسمہ اس سے کچھ فاصلے پر ہی بنایا گیا ہے۔ جسے عرف عام میں ابول الہول کہا جاتا ہے۔

ابو الہول:

ابوالہول کا سر انسانی ہے جو کہ عقل و دانش اور جسم شیر کا ہے جو طاقت کی علامت ہے۔ یہ مجسمہ خیفر نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا اور یہ بھی لائم اسٹون کے پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ ابوالہول کے بارے میں ہمیں ہمارے گائیڈ سے جو کہانی ملی وہ کچھ یوں ہے کہ ایک نو عمر لڑکا اس صحرائی راستے سے گزر رہا تھا اور رات اس نے اس ٹیلے جو کہ اب ابوالہول ہے، کے نیچے گزاری۔ خواب میں مجسمے کے مالک کو دیکھا جو کہ اس سے یہ گزارش کر رہا تھا کہ مجھے اس مٹی کے ٹیلوں سے آزاد کرو۔ اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے تو تم خیفر کی طرح مصر پر حکومت کرو گے۔ اس خواب کے بعد اس لڑکے نے ابوالہول کو مٹی کے ٹیلے سے دریافت کیا جو حوادث زمانہ میں مٹی تلے دفن ہو چکا تھا۔ خیفر کی دعا پوری ہوئی اور وہ لڑکا مصر کا سربراہ یعنی اپنے زمانے کا فرعون بنا۔

ابوالہول کے دائیں طرف ایک عبادت گاہ بنی ہوئی ہے، جسے "ٹمپل ویلی" کہا جاتا ہے۔ اس کے ستون اسوان کے بہترین گرینائٹ سے بنے ہوئے ہیں یہاں فرعون یا اس کے گھرانے کے لوگوں کی میتوں کو حنوط کیا جاتا تھا۔ حنوط کا عمل ستر دنوں میں مکمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد حنوط شدہ، کتانی پٹیوں میں لپٹی میت کو شاہوں کے لئے مخصوص کیے گئے تابوت میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس دوران حنوط کا عمل بجانب لانے والا راہب موت کے خدا "انوبیس" کا ماسک پہنتا، تاکہ فرعون کا جسم اس کی حفاظت میں رہے۔ اس عبادت گاہ سے نکلنے والی راہداری کے اطراف چند تاریک سے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ ان راہبوں کا آشیانہ ہوا کرتا تھا۔ راہداری کے بیرونی سرے پر دور سے ہی اہرام نظر آ جاتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آخری سفر اسی راستے گزر کر ہوتا تھا۔

میں خیالوں میں گم راہدری سے کھلی ہوا میں نکل آئی۔ سر اٹھا کر ابولہول کو دیکھا اور سوچا کہ "تمہاری میت اس وقت کہاں ہوگی۔ کسی عالی شان میوزیم میں یا کوئی چور اچکا تمہاری سوکھی ہڈیوں سے چند قیمتی نوادرات اتار کر تمہیں کہیں پھینک گیا ہوگا۔ جب تم دوسری دنیا میں داخل ہوگے تب اپنے گمشدہ جسم کو کہاں ڈھونڈو گے۔ تمہارا جاہ و جلال اور مال و اسباب کیا ہوا۔ دنیا تمہارے فلک بوس مقبرے کو دیکھنے آتی ہے اور تمہاری تاریخ دنیا کے نامور جامعات میں پڑھائی جاتی ہے۔ مگر تم اپنی سوکھی ہڈیوں کے ساتھ پٹیوں میں جکڑے کسی شیشے کی دیوار کے پیچھے دنیا کے لئے عبرت کا نمونہ بن کر پڑے ہو۔"

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اقبال کے چند اشعار

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

☆---☆---☆

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆---☆---☆

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفی سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

☆---☆---☆

کون ہے تارک آئین رسول مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟
ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمد کا تمھیں پاس نہیں

☆---☆---☆

خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

☆---☆---☆

مزاحیہ تحریر

پاگل خانہ برائے فروخت

کشتاج

پرویز پشاوری کو نہ جانے کیوں لفظ پ سے اتنا پیار تھا۔ ویسے پیار تو ہوتا ہی لفظ پ سے ہے لیکن پرویز پشاوری کو پ ہی سے پیار تھا۔ اپنے ہر جملے میں لفظ پ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کرتے۔ پسند کا معیار چونکہ پ ہی تھا لہٰذا ان کی پیاری پتنی پلوشا جو کہ پہلے ان کی پڑوسن تھی، ہمیشہ ان کی پسند کا خیال رکھتیں۔ یعنی جب وہ پلوشا کو بلا کر پسندیدہ کھانے کی فرمائش کرتے تو وہ پالک پنیر یا پلاؤ مع پیاز اور پودینے والی سلاد کے پورا دستر خوان سجا دیتی۔ اور جب وہ سونے کے لئے کمرے میں جا رہے ہوتے تو ان کے لئے پردے، پینٹنگز، پیر دان، پنکھے، پلنگ وغیرہ کے پوشوں سے پورا کمرا مزین کر کے رکھ دیتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے پرویز پشاوری پردے کے پیچھے پڑی پلنگ پر پیٹ کے بل پڑے ہوئے تھے۔ پاؤں پتنگ کی طرح ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔ پر وہ پیپر اور پین سنبھالے کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہے تھے۔ چونکہ کاروبار ان کا اپنا پرنٹڈ پریس تھا، تو پیسہ تو خوب تھا ہی، پر اس کو استعمال کرنے کے لئے ہمیشہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ جیسے کہ آج کل وہ اپنی ایک اور پراپرٹی بنانے کی فکر میں تھے اور ان کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کوئی پلاٹ خریدیں یا پٹرول پمپ۔ دن بھر پیاری پتنی کے ساتھ پلاننگ کرتے رہے تھے اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کس چیز کا سودا کیا جائے۔ اور جب سوچ سوچ کر پیشانی پر بل تک پڑ گئے تو انہوں نے 'پینا ڈول' کی تلاش شروع کر دی اور وہ نہ ملنے پر 'پونسٹان' کھا کر سو گئے۔ صبح پانچ بجے اٹھے۔ پپیتہ کھایا۔ اپنی پراڈو نکالی اور پریس کی طرف روانہ ہو گئے۔

بیگم صاحبہ بھی ان کے ساتھ ہی گھر سے نکل پڑیں۔ اور یہ معمول کی بات تھی۔ وہ سوسائٹی ورکز کا کہہ کر گھر سے نکل جاتی تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی پلوشا کی پوتر تا پر شک نہ کیا۔ چونکہ خود بھی پولیٹکس کی ایک پارٹی سے منسلک تھے، اسی لئے وہ وہاں مصروف ہو جاتے۔ پارٹی میں بھی وہ شوقیہ ہی آئے تھے کیوں کہ جوانی میں جب ان کو پارٹی میں آنے کی سوجھی تو یہاں بھی پسندیدہ 'پ' کا ایک آپشن موجود تھا۔ وہ بھی اتنی بار۔۔۔۔۔ واہ واہ۔۔۔۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے اور جھٹ سے پارٹی میں پھنس گئے تھے۔

فی الحال تو وہ اپنے پریس کی طرف جا رہے تھے۔

راستے میں ایک بڑی سی عمارت پر لکھی تختی نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ تختی پر لکھا تھا "پاگل خانہ برائے فروخت"۔ پہلے تو وہ بھی حیران رہ گئے کہ کوئی پاگل خانہ کیسے فروخت کیا جا سکتا ہے لیکن پھر سوچا کہ یہ تو میری قسمت ہے کہ کوئی پ سے پراپرٹی مل گئی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور جھٹ سے پراڈو روکی اور پاگل خانہ کے آفس میں داخل ہو گئے۔

پاگل خانے کا مینیجر انھیں آفس میں پانی پیتا ملا۔

"کیا آپ اس پاگل خانے کو بیچنا چاہتے ہیں؟" پرویز پشاوری نے سوال کیا۔

"جی ہاں بالکل۔ تشریف رکھیے۔"

"پھر تو میں اسے ضرور خریدوں گا۔" پرویز نے کہا اور سامنے رکھی کرسی پر پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔

مینیجر نے میز پر رکھی گھنٹی بجا کر پیون کو بلا کر چائے منگوائی تھی۔

جب مینیجر نے دیکھا کہ اتنی دیر گزر گئی اور چائے کا کپ جوں کا توں ہی رکھا ہے، تو اس نے ان کی توجہ اس طرف دلائی۔

"مینیجر پاجی۔۔۔۔ پیالی میں پیش کر دیں تو میں پی لوں۔"

اور پھر چائے پینے کے بعد وہ دونوں پاگل خانے کے معائنے کے لئے نکل پڑے۔

مینیجر پرویز صاحب کو پاگل خانے کے اندر لے گیا۔ یہاں بہت سے پاگل تھے۔ ظاہر ہے پاگل خانے میں پاگل نہ ہوں گے تو اور کون ہو گا!۔

پرویز کی نظر ایک ایسے پاگل پر پڑی جو اپنے پاؤں پولیتھین بیگ میں ڈالے چل رہا تھا۔

پرویز پشاوری کو جب سیاحی کا شوق پروان چڑھا تھا، تو پ سے محبت کی خاطر، پہاڑوں کی سیر کے بعد پاگل خانوں کی بھی سیر کر ڈالی تھی، اسی لئے اب سمجھ گئے کہ اس پاگل کی یہ سب کرنے میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ لیکن سمجھ نہ پائے اسی لئے پوچھ بیٹھے۔

"پاگل بھائی! ذرا یہ تو بتا کہ اس طرح اس پلاسٹک کی تھیلی میں پاؤں ڈال کر چلنے میں کونسا راز پوشیدہ ہے۔؟" تو اس نے بتایا کہ "اس طرح میں بورا ریس کی پریکٹس کر رہا ہوں۔۔۔ جو پچھلے سال منعقد ہوئی تھی۔"

پرویز پشاوری نے پاگل کے ایک ہی جملے میں جو دو پ سنے۔۔۔۔ تو خوشی سے اثبات میں سر ہلاتے آگے بڑھ گئے۔ ورنہ بات تو ان کے سر کے پچاس فٹ اوپر سے پرواز کر گئی تھی۔

وہ اچانک پیچھے مڑے اور مینیجر سے بولے۔

"پاجی! مجھے اپنی پیاری پتنی پلوشا سے فون پر بات کرنا ہے۔ جلدی سے کسی پُر سکون جگہ لے چلیے۔"

"ارے پرویز صاحب! ایسی جگہ تو بس ہمارا ٹائیلٹ ہی ہے اتفاق سے ان پاگلوں کا اس طرف بہت کم آنا جانا ہے۔"

"تو لے چلئے جناب، پیشاب خانہ ہی سہی لیکن مجھے پلوشا سے پانچ بجے ضرور بات کرنا ہے۔"

واہ واہ یہاں تو پرندے کے پر مارنے کی بھی آواز نہیں آ رہی۔

اور اس طرح وہ پورے پانچ بجے اپنی پیاری پتنی پلوشا سے بات کرنے میں کامیاب ہو سکے۔۔ پانچ بج کر پندرہ منٹ پر رابطہ منقطع کر کے پھر سے پاگل خانے کے ان اطراف پہنچ گئے جہاں پاگل بکثرت پائے جاتے تھے۔

ایک پاگل درخت پر چڑھا تھا اور باقی سارے اسے نیچے اتار دینے کے لئے پریشان کہ کس طرح نیچے آئے گا۔ پرویز کو فوری طور پر یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی وہ ایک ایسا واقعہ دیکھ چکے ہیں۔۔۔ اور پھر یاد کرنے لگے کہ آخر ایسی سچویشن میں اس پاگل کو نیچے اتارنے کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

آخر کار انہیں یاد آ ہی گیا کہ ایک پُر مغز پاگل نے رسی سے باندھ کر نیچے کھینچ لیا تھا۔۔۔ اور بتایا بھی تھا کہ اس سے پہلے اس نے بہت سوں کی جان ایسے ہی بچائی ہے۔ پرویز صاحب کی یادداشت اتنا ہی یاد دلا سکی اور انہوں نے یہاں بھی یہ آئیڈیا دے دیا اور آگے بڑھ گئے یہ بات تو وہ بھول ہی چکے تھے کہ پچھلی دفعہ بھی درخت پر چڑھا پاگل مفت میں ضائع ہو گیا تھا۔

اور پھر ایک جگہ جب وہ بہت گہرا گڑھا کھودتے کچھ پاگلوں پر سرسری سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھے تو مینیجر نے کہا۔

"حیرت ہے آپ نے اس معاملے میں ذرا دلچسپی نہیں ظاہر کی۔۔۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"اجی میری عقل پر کوئی پردے تھوڑی پڑے ہوئے ہیں کہ سمجھ نہ سکوں۔ مجھے پتہ ہے یہ سارے پاگل اس لمبے سے گڑھے کو پورا کھودنے کے بعد اُلٹا کر کے مینار پاکستان جتنا بڑا قلعہ بنائیں گے۔" وہ خود کو داد دیتے ہوئے بولے۔ اور اترانے لگے کہ واہ واہ۔۔۔ تجربہ کتنی کام کی چیز ہے۔ اور مینیجر ان کی دانست میں شرم سے پانی پانی گویا یعنی پسینہ پسینہ ہو گیا۔

"اگر آپ معائنہ کر چکے ہوں تو چلیں بات طے کر لیں۔"

"ہاں بالکل چلیں۔"

"تو جناب پرویز پشاوری صاحب۔ اس پاگل خانے کی قیمت ساڑھے پانچ کروڑ ہے۔ کل ادا کر رہے ہیں؟"

"کیا مطلب۔۔۔ ساڑھے پانچ کروڑ!۔۔۔ اتنی زیادہ۔۔۔" پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "چلیں پورے پانچ کروڑ کر لیں۔"

"لیکن جناب پچاس لاکھ کم کر دینا کوئی اتنا آسان کام تو نہیں۔"

"میں نے آپ کو کونسا پتھر ڈھونے جیسا مشکل کام کہا ہے جو آپ ایسے کہہ رہے ہیں۔ صرف پچاس لاکھ ہی تو کم کرنے کو کہا ہے۔"

"دراصل بڑے صاحب نے کہا ہے کہ یہ پاگل خانہ ساڑھے پانچ کروڑ ہی میں بیچنا ہے۔ پھر میں کیسے۔۔۔۔۔۔"

"مجھے ان کا پتہ بتائیں میں ان کے پاؤں پڑ لوں گا، ان کے ہاتھ پیر جوڑوں گا، شاید اس طرح ان کا دل پسیج جائے۔ لیکن میں یہ پاگل خانہ پورے پانچ کروڑ ہی میں خریدوں گا۔"

"ارے نہیں بھائی ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ انہوں نے فائنل قیمت یہی بتائی ہے۔"

"ارے تو کیا ان کا لکھا کوئی پتھر کی لکیر ہے کہ وہ جو کہیں گے وہی ہو گا۔" وہ اچانک چراغ پا ہو کر بولے پھر جیب سے پان نکال کر منہ میں رکھ کر چبانے لگے۔

"اوہو یہ پاگل خانہ ان ہی کا ہے نا۔۔۔ پھر میں کیسے کنسیشن کر سکتا ہوں۔"

"پاجی کنسیشن تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا میں اس پاگل خانے کو کسی بھی قیمت پر پورے پانچ کروڑ میں خریدنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟۔۔۔۔" وہ انہیں گھورنے لگا۔

"مطلب یہ کہ تم چاہو تو مجھ سے الگ سے پانچ کروڑ لے لو لیکن یہ پاگل خانہ میں پورے پانچ کروڑ ہی میں لوں گا۔"

مینیجر پریشانی کے عالم میں سامنے بیٹھے وجود کی دماغی حالت کو سمجھنے میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اور دھیرے سے بڑبڑا گیا کہ اس طرح تو یہ دس کروڑ کا پاگل خانہ خرید رہا ہے۔

شاید سوچتے ہوئے منہ سے بھی پھسل گیا تھا۔

"کک کیا۔۔۔ دس کروڑ۔۔۔ میں کب سے کہہ رہا ہوں کہ میں یہ پاگل خانہ پانچ کروڑ ہی میں لوں گا اور اب تم دس کروڑ بتا رہے ہو۔ ارے میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔ میں نے پائی پائی کر کے یہ پیسے جوڑے ہیں اور تو مجھے لوٹنا چاہتا ہے۔۔۔۔"

"ارے سنئے تو۔۔۔۔" مینیجر اپنی غلطی پر دل ہی دل میں خود پہ پشیمان ہو رہا تھا۔

"ارے پرے ہٹ۔۔۔ پاگل نہ ہو تو۔۔۔ پانچ کی پراپرٹی دس میں بیچ رہا ہے۔۔۔ میں نے پائی پائی جوڑ کر یہ پیسے جمع کئے ہیں۔ پ سے پراپرٹیز جمع کرنے کے پیسے جمع کرنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلے ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا پانچ پیسے میں، میں پوری پارلیمنٹ ہی خرید لیتا۔" انہوں نے غصے سے کہا اور پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

☆---☆---☆

اقتباس

محبت چھلاوہ ھے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی اصل حقیقت بڑی مشکل سے سمجھ آتی ھے کچھ لوگ جو آپ سے اظہار محبت کرتے ھیں اتصال جسم کے خواہاں ھیں۔ کچھ آپ کی روح کے لیئے تڑپتے ھیں کسی کسی کے جذبات پر آپ خود حاوی ھو جانا چاھتے ھیں۔ کچھ کو سمجھ سوچ ادراک کی سمتوں پر چھا جانے کا شوق ھوتا ھے۔۔۔۔ محبت چھلاوہ ھے لاکھ روپ بدلتی ھے۔۔۔۔ اسی لیئے لاکھ چاھو ایک آدمی آپ کی تمام ضرورتیں پوری کر دے یہ ممکن نہیں۔۔۔۔ اور بالفرض کوئی آپ کی ھر سمت ھر جہت کے خلا کو پورا بھی کر دے تو اس بات کی کیا گارنٹی ھے کہ آپ اس کی ھر ضرورت کو ھر جگہ ھر موسم اور ھر عہد میں پورا کر سکیں گے۔۔۔۔ انسان جامد نہیں ھے بڑھنے والا ھے اوپر دائیں بائیں۔۔۔۔ اس کی ضروریات کو تم پابند نہیں کر سکتے۔۔۔

(از بانو قدسیہ۔۔۔ راجہ گدھ)

شعر و شاعری

شیشے کے اُس پل کے پار

رنگ، روشنی اور چراغ
سب شیشے کے اس پل کے پار
محبت، چاندنی اور سراب
دھند، دھوکے اور خواب
وعدے، قسمیں، سب الفاظ
برف کے بت یا صحرا ہزار
بارش، بادل یا پھوار
بڑھاپا، جوانی یا بچپن کے یار
سب شیشے کے اس پل کے پار

شاعر: جوئیاں

میں شاد کیوں نہیں ہوں

تنہائیوں کے میلے
میلے میں ہم اکیلے
اکثر یہ سوچتے ہیں
یہ شام سرمئی سی
اور صبح نقرئی سی
ہے میرے ساتھ پھر بھی
میں شاد کیوں نہیں ہوں
آباد کیوں نہیں ہوں
ہے ذات میں مری اب
اِس شام کے اندھیرے
پھر صبح کی وہ ٹھنڈک
کیوں ذات میں نہیں ہے
ہر پل اداسیوں کے
کیوں قافلے یہ لائی
آواز ہی نہیں ہے
کیوں خامشی تنی ہے
اِس خامشی میں دل کی
دھڑکن سنی ہے میں نے
دھڑکن میں سسکیاں ہیں
آہیں ہیں، ہچکیاں ہیں
تنہائیوں کا رونا
روتا ہے اب مرا دل
خوشیوں کے گیت گانا
چاہتا ہے اب مرا دل

شاعرہ: ندا سلیمان

میں اور اب نہیں جیوں گی

نئے آسماں کے نیچے

نئی زمیں پر

نئے خواب نہیں بنوں گی

نئے موسم نہیں گنوں گی

میرے خوابوں میں پرانی مٹی کا پرانا پانی سما چکا ہے

میرے رخ کو گزری ہوا کا سایہ لبھا چکا ہے

روشنی کے وہ عکس، اپنی بے جان حقیقتوں میں میری آنکھوں پر بندھ چکے ہیں

میرے پیر گزرے وعدوں کی بیڑی تھامے

مجھ میں گڑے ہیں

میں اسی پرانی رت میں شل ہوں جو پہلی سحر بنی تھی

میرے لہو میں اسی سحر کی صدائیں اب تک گونجتی ہیں

میں نئی زمیں پر نہیں پھلوں گی

میں یہاں سے آگے نہیں چلوں گی

یہ ضد ہے میری

اگر نہ واپس جا سکی میں

میں اور اب نہیں جیوں گی

شاعرہ: رافعہ خان

غزل

سن کے مانوس سی کوئی آہٹ
آس کے دیپ تم جلاؤ کبھی

سب کو بھاتا ہے پیار کا کاجل
آنکھ میں تو اسے لگاؤ کبھی

یہ حیا بھی تو ایک زیور ہے
خود کو اس سے ذرا سجاؤ کبھی

میری نظریں پکارتی ہیں تمہیں
ایک دو پل کو لوٹ آؤ کبھی

دل کی دھرتی پہ بو کے پیار کا بیج
عاشقی کی فصل اُگاؤ کبھی

میرے جذبات سو گئے شاید
لمسِ معصوم سے جگاؤ کبھی

دل میں جلتے ہیں پیار کے شعلے
اور بھڑکانے ان کو آؤ کبھی

میرا دل ہے خلوص کا دریا
آب، دریا سے لے کے جاؤ کبھی

اب ندا کو کچھ اور غم دے دو
اُس کی ہمّت تو آزماؤ کبھی

شاعرہ : ندا سلیمان

غزل

آئینے کو دیکھتا میں رہ گیا
تھا مرے چہرے پہ اک چہرہ نیا

قدر مرا ویسے کا ویسے ہی رہا
شمس کا پابند تھا سایہ مرا

بحرِ ہستی میں کہاں مضمر سکون
ہیں بھنور، گرداب اور موجِ بلا

دیکھتے ہی صبحِ کاذب کی جھلک
ہوتے ہیں رخصت، چراغوں نے کہا

اک نئے پودے کی افزائش ہوئی
پھل شجر سے ٹوٹ کر جب گر گیا

وقت آیا تو ہوا یہ منکشف
ریت کی دیوار پر تھا آسرا

خامہ سے بہتا رہا رنگِ حسن
اور آہنگِ غزل بنتا رہا

شاعر:
حسن آتش چاپدانوی

غزل

جہاں نے تماشا بنایا ہمیں
کہاں جذبِ دل کھینچ لایا ہمیں

وطن کی بہاریں جو دیکھیں تو پھر
کوئی اور منظر نہ بھایا ہمیں

بنامِ مداوائے غم دل لگی
یہ طورِ جہاں خوش نہ آیا ہمیں

ثریا سے تحت الثریٰ میں گرے
زمانے نے وہ دن دکھایا ہمیں

مصائب کی ہر سو کڑی دھوپ میں
دیاماں کی آنچل نے سایا ہمیں

تری رہ میں تھے چشم و دل فرشِ راہ
نظر تیرا جلوہ نہ آیا ہمیں

ہم آجاتے ساری حدیں توڑ کر
کبھی تو نے دل سے بلایا ہمیں؟

ستاروں سے آگے پہنچ تو گئے
زمیں پر بھی چلنا نہ آیا ہمیں

نہیں روک سکتا رہِ صدق سے
نہ اپنا، نہ کوئی پرایا ہمیں

مبارک ہوں خوشیاں اُسی کو فرید
شب و روز جس نے ستایا ہمیں

شاعر : فرید ندوی

اس ماہ کے شاعر

ماجد صدیقی

غزل

نظر اُٹھے بھی تو خُود ہی کو دیکھتا ہوں میں
نجانے کون سے جنگل میں آبسا ہوں میں

یہ کس ہجوم میں تنہا کھڑا ہوا ہوں میں
یہ اپنے آپ سے ڈرنے سا کیوں لگا ہوں میں

وگرنہ شدّتِ طوفاں کا مجھ کو ڈر کیا تھا
لرز رہا ہوں کہ اندر سے کھوکھلا ہوں میں

یہ کیوں ہر ایک حقیقت لگے ہے افسانہ
یہ کس نگاہ سے دُنیا کو دیکھتا ہوں میں

برس نہ مجھ پہ ابھی تندیٔ ہوائے چمن
نجانے کتنے پرندوں کا گھونسلا ہوں میں

تمہاری راہ میں وہم و گماں کا جال تو تھا
مجھے یہ دُکھ ہے کہ اِس میں اُلجھ گیا ہوں میں

یہ کس طرح کی ہے دِل سوزی و خنک نظری
یہ آ کے کون سے اعراف پر کھڑا ہوں میں

اِس اپنے عہد میں، اِس روشنی کے میلے میں
قدم قدم پہ ٹھٹکنے سا کیوں لگا ہُوں میں

مری زمیں کو مجھی پر نہ تنگ ہونا تھا
بجا کہ چاند کو قدموں میں روندتا ہوں میں

سکوتِ دہر کو توڑا تو میں نے ہے ماجد
یہ ہنس دیا ہوں نجانے کہ رو دیا ہوں میں

غزل

ننگے سچ کے لفظ زباں پر کیا کیا تھے
اور بچّوں کے ہاتھ میں پتھّر کیا کیا تھے

چھوڑا لیں تو پھول کہیں تحلیل نہ ہو
پہلے پہل کے عشق کے بھی ڈر کیا کیا تھے

پیروں میں جب کوئی بھی زنجیر نہ تھی
ان وقتوں میں ہم بھی خود سر کیا کیا تھے

دُور نشیمن سے برسے جو مسافت میں
ژالے تن پر سہنے دُوبھر کیا کیا تھے

حرص کی بین پہ کھنچ کر نکلے تو یہ کھلا
دیش پٹاری میں بھی اژدر کیا کیا تھے

جھانکا اور پھر لوٹ نہ پائے ہم جس سے
اُس آنگن کے بام تھے کیا، در کیا کیا تھے

طاق تھے ماجد تاج محل بنوانے میں
اپنے ہاں بھی دیکھ! اکابر کیا کیا تھے

مزاحیہ شاعری

مزاحیہ کلام

مرد ہونی چاہیے، خاتون ہونا چاہیے
اب گریمر کا یہی قانون ہونا چاہیے

رات کو بچے پڑھائی کی اذیت سے بچے
ان کو ٹی وی کا بہت ممنون ہونا چاہیے

دوستو انگلش ضروری ہے ہمارے واسطے
فیل ہونے کو بھی ایک مضمون ہونا چاہیے

نرسری کا داخلہ بھی سرسری مت جانیے
آپ کے بچے کو افلاطون ہونا چاہیے

صرف محنت کیا ہے انور کامیابی کے لیے
کوئی اُوپر سے بھی ٹیلیفون ہونا چاہیے

انور مسعود کی شاعری سے انتخاب

شادی شدہ کی نصیحت

بیوی یہ میری، اپنی ادائیں
کچھ یوں مجھ پر لٹاتی ہے
جیسے کہ ڈسپرین پانی میں
اُبل کر اُوپر آتی ہے
ہر روز نیا بہانہ کر کے
مجھے شاپنگ پر لے جاتی ہے
ڈاکو کی طرح گن پوائنٹ پر
میرا ڈھیروں خرچ کراتی ہے
معمولی لڑائی جھگڑوں پر
بھائیوں کو اپنے بلاتی ہے
پھر اُن کے سامنے رو رو کر
مجھے خوب چھتر پڑواتی ہے
میری تم کو نصیحت ہے یارو
شادی نہ کرنا بھولے سے
یہ بیوی وہ شے ہے کہ جو
تا عمر انگلیوں پر نچاتی ہے

شاعر: سمیر

گوشۂ خواتین

گرل چکن ان ٹماٹو سوس

ترکیب: وجیہہ

چکن۔۔۔1 یا2 بریسٹ پیس

زیتون کا تیل۔۔۔ایک چائے کا چمچ یا نارمل کوکنگ کا تیل

ووسٹر شائر سوس۔۔۔1 کھانے کا چمچ

سویا سوس۔۔۔1 کھانے کا چمچ

براؤن شوگر۔۔۔1 چائے کا چمچ

زیرہ۔۔۔ایک چائے کا چمچ (کٹا ہوا اور بھنا ہوا)

دھنیا۔۔۔ایک چائے کا چمچ (کٹا ہوا اور بھنا ہوا)

ادرک، لہسن پسا ہوا۔۔۔ایک ایک چائے کا چمچ

نمک، کالی مرچ، کٹی ہوئی لال مرچ، پسی لال مرچ۔۔یہ سب حسبِ منشاء۔۔۔

ترکیب:

یہ سب چکن میں ملا کر 3 گھنٹوں کے لئے رکھ دیں، اس کو 180 ڈگری اوون میں بیک کر لیں۔

اب جب یہ گرل ہو جائے تو اس کو سرونگ پلیٹ میں نکال لیں۔

ٹماٹو سوس

2 بڑے ٹماٹر، ایک جوا لہسن کو چھلکا اور بیج نکال کر پیس لیں، پھر نان اسٹک پین میں ہلکا سا بھون لیں۔۔نمک، لال مرچ، کٹی ہوئی لال مرچ اس میں ڈال دیں، ذرا سا گاڑھا ہو جائے تو چکن کے اوپر ڈال دیں۔ سلاد یا ابلے ہوئے چاول یا ابلے ہوئے نوڈلز کے ساتھ کھائیں۔

اگر آپ چکن گرل نہ کرنا چاہیں تو ایک چائے کے چمچ تیل میں فرائی کر لیں، مگر پھر میرینیڈ میں تیل نہیں ملانا ہے۔

چکن منچورین

ترکیب: سعدیہ محمد

چکن۔۔۔آدھا کلو (بغیر ہڈیوں کے یعنی بون لیس)۔

میرینیڈ کرنے کے لیے۔۔۔

نمک۔۔۔آدھا چائے کا چمچ

سرخ مرچ کٹی ہوئی۔۔۔ایک چائے کا چمچ

ادرک لہسن پیسٹ۔۔۔ایک چائے کا چمچ

ان تینوں چیزوں کو چکن پہ لگا کر اچھی طرح سے مکس کر لیں اور چکن کو ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔

اجزاء۔

آئل۔۔۔چوتھائی کپ

ادرک لہسن۔۔۔ایک سے ڈیڑھ کھانے کے چمچ (چاپ کی ہوئی)

نمک۔۔۔آدھا چائے کا چمچ

لال مرچ پاؤڈر۔۔۔دو چائے کے چمچ

ٹماٹر۔۔۔تین عدد درمیانے سائز کے باریک کٹے ہوئے۔۔۔(زیادہ ڈالنا چاہیں تو ڈال سکتے ہیں اور کوشش کریں کہ لال ٹماٹر ہوں)۔

کیچپ۔۔۔دو کھانے کے چمچ

چلی ساس یا باٹ ساس۔۔۔دو کھانے کے چمچ

مرغ کی یخنی۔۔۔ایک کپ

کارن فلور۔۔۔دو کھانے کے چمچ

پکانے کا طریقہ:

پتیلی میں تیل گرم کریں اس میں چاپ کی ہوئی ادرک لہسن ڈال دیں اور ہلکا سا فرائی کر لیں اتنا فرائی کرنا ہے کہ ادرک لہسن کا رنگ نہ بدلے۔

اس میں ٹماٹر ڈال دیں۔

اب ان کو اچھی طرح بھونیں، یہاں تک کہ ٹماٹر کا پیسٹ بن جائے اور ٹماٹر آئل چھوڑ دے۔

اب اس میں میرینیڈ کیا ہوا چکن ڈال دیں اور اسے اچھی طرح سے فرائی کر لیں اتنا کہ چکن پک جائے۔

اب اس میں ٹماٹو کیچپ، نمک، لال مرچ، چلی ساس، یخنی ڈال دیں اور ہلکا سا فرائی کر لیں۔

اب تقریباً ایک کپ پانی لے لیں اور اس میں کارن فلور گھول لیں۔ اب آہستہ آہستہ کارن فلور ڈالیں اور ساتھ ساتھ چمچ ہلاتے رہیں۔

بس ایک دو منٹ چمچ ہلائیں اور چولہا بند کر دیں۔

لیں جی آپ کا منچورین بلکہ چکن منچورین تیار ہے۔

کائنات کے کچن ٹوٹکے

★ اگر سالن بناتے ہوئے آخر میں شوربے، قورمے یا سبزی کے اوپر گھی یا تیل نہ آرہا ہو تو آدھا ٹی سپون سوکھی میتھی شامل کر دیں، چند ہی سیکنڈ کے اندر گھی اوپر آکر سالن کی رونق دوبالا کر دے گا۔

★ فرائنگ کا کام کرتے ہوئے آئل کی عجیب سی بُو پھیل جاتی ہے۔ تو اسے دور کرنے کے لیے دو ٹوٹکے دیتی ہوں۔ ایک تو یہ کہ فرائینگ کرتے ہوئے پاس کینڈل جلا کر رکھ لیں۔ ساری بُو کینڈل کی خوشبو میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ یا کسی برتن میں ساتھ پانی بھی اُبالتے جائیں لیکن اس پانی میں چھوٹی الائچی، دار چینی بھی ڈال لیں۔ تو اک خوشبو سی پھیل جائے گی۔

★ بونس ٹوٹکہ: میری ایک دوست فرائنگ کا کام کرنے کے بعد کچن میں اگر بتی جلا دیتی ہے۔ پھر تو فرائنگ کی بُو سرے سے ہی غائب ہو جاتی ہے۔

★ اورنج جوس یا کوئی دوسرا جوس پیتے ہوئے اگر اس میں زیادہ کھٹاس محسوس ہو تو ایک گلاس اورنج جوس میں ایک چٹکی کا لانمک ڈال کر مکس کر لیں۔ پی کر محسوس کریں کھٹاس غائب اور کتنا بہترین ذائقہ ہو گیا ہے۔

★ زردہ پکاتے ہوئے دم دینے سے پہلے اس میں ایک درمیانہ سپون تیل یا گھی شامل کر کے چاول مکس کر لیں۔ تو پکنے کے بعد دیکھیے گا چاولوں کے اوپر ایک شائن سی آجائے گی۔

★ بعض دفعہ کھیر بنانے کے بعد بھی اس میں چاول اور دودھ علیحدہ علیحدہ سے نظر آتے ہیں۔ تو گھبرائیے مت، ہینڈ مکسر لیں اور اس میں تھوڑا چلا کر مکس کر لیں اور تھوڑا پکا لیں۔ لیجیے کھیر اچھی طرح مکس ہو جائے گی اور پرابلم بھی حل۔

★ نوٹ: اگر یہی طریقہ آپ گاجر کی کھیر یعنی گجریلا میں استعمال کر لیں تو اور بھی اچھا رزلٹ ملے گا۔ گاجر کھیر میں علیحدہ سے نظر نہیں آئے گی۔ اور بہت پیارا پنکش سا کلر پوری کھیر کا ہو جائے گا۔ جو دیکھنے میں بھی بہت اچھا لگے گا۔ اور کھیر کا ذائقہ بھی مزیدار ہو گا۔

★ اگر باتھ روم کی صفائی کرنے والے لیکوئیڈ ختم ہوں تو واشنگ پاؤڈر یعنی سرف سے اپنے باتھ ٹب اور سینک کو صاف کیجیے۔ دیکھیے کتنے صاف شفاف اور چمکدار ہو گئے ہیں۔

بیوٹی ٹپس

ٹپس : ابیل

اگر آپکے بال تیزی سے گر رہے ہیں تو اس کی ایک اہم وجہ خشکی بھی ہو سکتی ہے یا آئرن کی کمی بھی۔ ہفتے میں ایک بار بالوں میں تیل ضرور لگائیے۔

تیل بنانے کے لیے

ناریل کا تیل۔۔۔۔ آدھا کپ

زیتوں کا تیل۔۔۔۔ آدھا کپ

کیسٹر آئل۔۔۔۔ آدھا کپ

بادام کا تیل۔۔۔۔ آدھا کپ

ان سب کو ایک بوتل میں ڈال کر اس میں 6 عدد کالی مرچیں ڈال دیں اور پھر بالوں میں لگائیے۔۔

★★★★★★★★

ہاتھوں کی حفاظت کے لیے کچھ ٹپس۔

ہمارے ہاتھوں کی جلد بہت نازک ہوتی ہے اس لیے جلد پر جھریاں پڑتی ہیں۔ کیونکہ اس میں چکنائی پیدا کرنے والے غدود نہیں ہوتے ہیں۔

نہانے یا ہاتھ دھونے یا برتن دھوتے وقت اپنے ہاتھوں پر تیل کی مالش کر لیں۔

چہرے پر لگانے والے ماسک بھی ہاتھوں کے لیے مفید ہیں۔

آج کل گاجروں کا موسم ہے روزانہ ایک پاؤ گاجریں کھائیں اس سے آنکھوں کی چمک بڑھتی ہے۔ صحت مند آنکھوں کے لیے وٹامن اے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وٹامن اے انڈے کی زردی مچھلی مکھن اور سبز پتوں والی سبزیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

★★★★★★★★

آنکھیں آپ کے چہرے کی خوبصورتی کا ایک اہم جزو ہیں ان کی حفاظت کیجیے۔

آنکھوں کے گرد بادام کا تیل لگا کر بہت نرم ہاتھوں سے مساج کریں۔ گلاب کے عرق میں روئی کے پھاہے بھگو کر رکھ دیں اور دس منٹ تک فریج میں ٹھنڈا ہونے دیں اس کے بعد آپ اپنی آنکھوں پر لگا لیں دس منٹ تک یا جب تک یہ پھاہے ہٹائے نہ جائیں آرام کیجیے۔

★★★★★★★★

ویب براؤزرز کا تقابلی جائزہ

تحقیق وتحریر: معاذ خان
معاونت: حفیظ توقیر

ویب براؤزرز کا تقابلی جائزہ لینے کے لئے ہم ان کو درج ذیل عوامل میں تقسیم کریں گے:

۱۔ اوپن ہونے کی سپیڈ
۲۔ ویب پیج ڈاؤنلوڈ کرنے کی سپیڈ
۳۔ ویب پیج rendering کا انداز
۴۔ مارکیٹنگ کی شرح
۵۔ متفرق ذرائع کے لحاظ سے جائزہ
۶۔ جائزہ بلحاظِ آپریٹنگ سسٹم
۷۔ خصوصیات کے لحاظ سے جائزہ

((webpage rendering کا مطلب ہے کہ اسے ڈاؤنلوڈ کرنے کے بعد براؤزر کس طرح یوزر کے سامنے ظاہر کرتا ہے مثال کے طور پر Mozilla Firefox پہلے مکمل ویب پیج ڈاؤنلوڈ کرتا ہے پھر یکدم مکمل پیج یوزر کے سامنے show کر دیتا ہے اس کے برعکس انٹرنیٹ ایکسپلورر میں جو چیز بھی ڈاؤنلوڈ ہوتی ہے وہ اسی وقت براؤزر پر ظاہر ہو جاتی ہے بجائے اس کے کہ مکمل ویب پیج ڈاؤنلوڈ ہونے کا انتظار کیا جائے۔))

ویب براؤزرز کا تقابلی جائزہ ان کے کھلنے کی سپیڈ کے لحاظ سے

سن 2011 میں Internet Browser Software Review Product Comparisons کیا گیا جسے درج ذیل ٹیبل میں ظاہر کیا گیا ہے:

	FireFox	Chrome	IE	Opera
کھلنے کی سپیڈ	14	8.1	8.5	7.1
کھلنے کی مجموعی سپیڈ	3.8	3.1	2.2	4.4

اس تجزیہ کے مطابق Opera لوڈ ہونے کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے۔

ویب براؤزرز کا تقابلی جائزہ ان کے ویب سائٹ کھولنے کی سپیڈ کے لحاظ سے

نئے براؤزرز کی کارکردگی کو جانچنے کے لئے SunSpider کا درج ذیل ٹیسٹ بہت مقبول ہوا۔

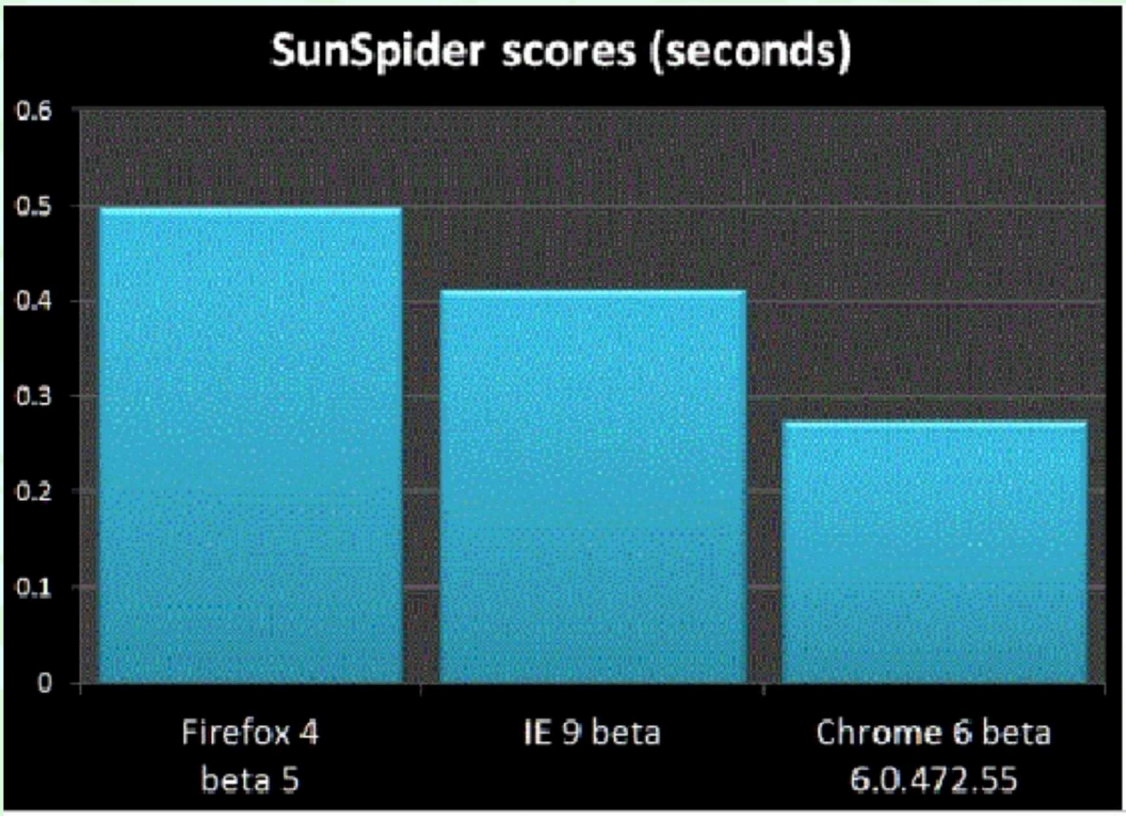

اس تجزیہ کہ مطابق Chrome 6 beta ویب سائٹ کھولنے کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے اور Chrome کا نیا ورژن (یعنی Chrome 7) اس سے بھی بہتر ہے۔

	Firefox	Chrome	IE	Opera
ویب سائٹ کھولنے کی سپیڈ	6.4	7	7.4	7.3

اس تجزیہ کے مطابق Mozilla Firefox پہلے نمبر پر ہے لیکن مجموعی طور پر IE9 اور Chrome 7 بہترین براؤزرز ہیں۔

ویب براؤزرز کا تقابلی جائزہ ان کے پیج rendering کے لحاظ سے

اس ضمن میں سب سے اچھا ویب براؤزر انٹرنیٹ ایکسپلورر ہے جو کہ مطلوبہ مواد کے ڈاؤنلوڈ ہونے کے ساتھ ہی اسے render بھی کر دیتا ہے اس کے برعکس Mozilla Firefox پہلے مکمل ویب پیج ڈاؤنلوڈ کرتا ہے اور پھر اس کے بعد show کرتا ہے۔ Chrome پیج کا کچھ حصہ ڈاؤنلوڈ کر کے اسے سکرین پر ظاہر کرتا ہے لیکن اس کی ڈاؤنلوڈنگ سپیڈ فائرفوکس اور انٹرنیٹ ایکسپلورر دونوں سے بہت زیادہ ہے۔

ویب براؤزرز کا تقابلی جائزہ مارکیٹنگ کی شرح کے لحاظ سے

ذیل میں ویب براؤزرز کی مارکیٹنگ رپورٹ پیشِ خدمت ہے:

نام	شرحِ مارکیٹ
IE	62.12%
FireFox	24.43%
Chrome	5.22%
Safari	4.53%
Opera	2.38%

Wikipedia کی ستمبر 2010 میں لی گئی رپورٹ

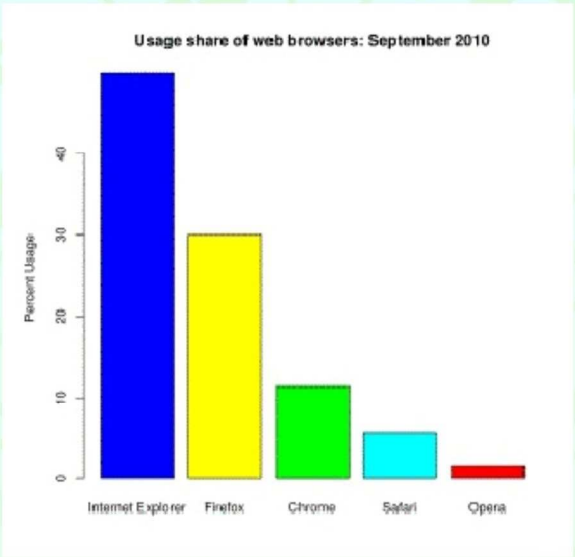

اس رپورٹ کے مطابق IE کو واضح برتری حاصل ہے اور یہ بھی بتاتا چلوں کہ IE8 سن 2010 میں سب سے نمایاں رہا۔

netmarketshare.com کے مطابق IE8 نے تقریباً 350 ملین وائرس کو بلاک کیا۔ IE7 اور IE8 نے مجموعی طور پر 125 ملین وائرس زدہ ویب سائٹس کو بلاک کیا، جو اس کی اعلیٰ کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ویب براؤزرز کا جائزہ، متفرق ذرائع سے

مشہور جریدہ Wall Street کے کالم نگار جناب Walter Mossberg کہتے ہیں کہ ''Chrome بہت جلد Firefox کو براؤزنگ میں مات دے دیگا''۔ Chrome کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا آسان ہونا، اس کا تیز رفتا ہونا، اس کا سیکورٹی پروف ہونا اور مطلوبہ معلومات تلاش کرنے میں معاون ثابت ہونا ہے۔ یہ Firefox اور IE کی نسبت جلدی سے لوڈ ہوتا ہے اور اس میں ایڈریس بار اور سرچ بار اکھٹی کر دی گئی ہیں جسکی وجہ سے ویب سائٹ کی ہسٹری دیکھنا اور سرچ کرنا مزید آسان ہوگیا ہے اور اس فیچر کی مقبولیت کے پیشِ نظر بہت سے جدید براؤزر مثلاً IE9 وغیرہ بھی اسے کاپی کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس میں کریشنگ وغیرہ کا concept ختم کر دیا گیا ہے۔ انٹرنیٹ ایکسپورر میں پبلک اور پرائیویٹ Tabs اکھٹی ہوسکتی ہیں جب کہ Chrome میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔ Chrome میں Ads بلاکنگ سسٹم میں کچھ خرابیاں ہیں یعنی کچھ ویب سائٹس پر بلاک ہونے کے باوجود Ads ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

IE9 کی بہترین پرفارمنس کا راز اس کا ہارڈ ویئر Acceleration کا استعمال کرنا ہے۔ یعنی CPU اور گرافک میموری کی مدد سے ویب سائٹ میں موجود Content یعنی تصاویر اور ٹیکسٹ کو لوڈ کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ یہی وہ واحد خصوصیت ہے جس نے IE9 کو باقی تمام براؤزرز سے ممتاز کر دیا ہے۔ Firefox اور Chrome نے IE9 کی پیروی کرتے ہوئے اپنے نئے ورژنز میں اس خصوصیت کا اضافہ کر دیا ہے۔ جس نے ان کی کارکردگی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

آپریٹنگ سسٹم (ونڈوز) کے لحاظ سے تقسیم

ذیل میں ہم جدول کی صورت میں یہ موازنہ کریں گے کہ کونسا براؤزر کس کس آپریٹنگ سسٹم پر چلتا ہے۔

نام	مائیکروسافٹ ونڈوز	☆ Mac OS X	☆ یونیکس	☆ BSD	☆ Other Unix
Google Chrome	جی ہاں	جی ہاں	جی ہاں	نہیں	نہیں
IE	جی ہاں	نہیں	نہیں	نہیں	نہیں
Opera	جی ہاں	جی ہاں	جی ہاں	جی ہاں	جی ہاں
Mozilla Firefox	جی ہاں	جی ہاں	جی ہاں	جی ہاں	جی ہاں
Safari	جی ہاں	جی ہاں	نہیں	نہیں	نہیں

ویب براؤزرز کی خصوصیات

۱۔ Internet Explorer

انٹرنیٹ ایکسپلورر کے جدید ورژنز میں درج ذیل خصوصیات موجود ہیں:

۱۔ Bookmarks (یعنی مطلوبہ ویب سائٹ لنک کو محفوظ کرنا تا کہ بعد میں اس ویب سائٹ کو اوپن کرنے میں آسانی ہو)

۲۔ Download Management

۳۔ Privacy (یعنی ذاتی استعمال کا ڈیٹا ہیکرز سے محفوظ کرنا۔IE8 میں In-Private Browsing اس مقصد کے لئے موجود ہے)

۴۔ Tabbed Browsing (یعنی دو یا زیادہ ویب سائٹ کو Tab کی صورت میں بیک وقت دیکھنا)

۵۔ Popup Blocking (یعنی Javascript کے فضول فنکشنز کو روکنا)

۶۔ Page Zooming (یعنی فونٹ وغیرہ کو بڑا کر کے دیکھنا)

۷۔ Access Keys (یعنی keyboard سے مطلوبہ پیج کو زوم کرنا، پرنٹ کرنا، سرچ کرنا، مینوٹک رسائی وغیرہ)

جبکہ انٹرنیٹ ایکسپلورر میں Spell-Checking (یعنی گرامر کی غلطیوں کی درستگی) سپورٹڈ نہیں۔

انٹرنیٹ ایکسپلورر میں درج ذیل ٹیکنالوجیز سپورٹڈ ہیں:

۱۔ CSS2.1 (CSS3 انٹرنیٹ ایکسپلورر کے ورژن IE9 میں سپورٹڈ ہے)

۲۔ Frames (یعنی دوسری ویب سائٹس کا کچھ حصہ ظاہر کرنا)

۳۔ HTML4.1 (IE9 میں HTML5 بھی سپورٹڈ ہے)

۴۔ Plugins مثلاً AciveX, Java, RSS وغیرہ سپورٹڈ ہیں

۵۔ IE9 میں جاوا اسکرپٹ کی ویب سائٹس بہت تیزی سے کھلتی ہیں یعنی IE9 میں javascript مکمل سپورٹڈ ہے۔

۶۔ پروٹوکولز میں HTTP, HTTPS, FTP, SSL سپورٹڈ ہیں

۷۔ امیج فارمیٹس میں GIF, PNG, JPEG, BMP سپورٹڈ ہیں جبکہ TIFF, SVG, XBM سپورٹڈ نہیں ہیں۔

۸۔ انٹرنیٹ ایکسپلورر میں ٹوٹل 33 لینگوئجز سپورٹڈ ہیں۔فی الحال اردو سپورٹڈ نہیں ہے۔

۲۔ Google Chrome

Google Chrome میں مندرجہ بالا ساری خصوصیات موجود ہیں۔کچھ اضافی خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ 50 زبانیں سپورٹڈ ہیں

۲۔ ہر Tab کا علیحدہ پروسیس ہوتا ہے جسکی وجہ سے ایک خراب Tab دوسرے پر اثر نہیں ڈالتی (دوسرے تمام براؤزرز میں ایسا نہیں ہے)

۳۔ ویب پیج بہت تیزی سے Render ہوتا ہے

۴۔ ڈائریکٹ سرچ کی سہولت موجود ہے

۵۔ بہت ہی Simple سٹائل ہے (یعنی ہر کوئی آسانی سے استعمال کرسکتا ہے)

۶۔ Win7 میں آسانی سے Taskbar میں کسی بھی پیج کو Pin کیا جاسکتا ہے تاکہ بعد میں ڈائریکٹلی ایکسس کرسکیں

۷۔ پروگرامرز کے لئے بہترین کوالٹی والے Debugging Tools موجود ہیں

۸۔ پروگرامرز کے لئے Open Source کی شکل میں موجود ہے

۹۔ بہترین Download Management سسٹم اور بہترین History Handling سسٹم موجود ہے

۱۰۔ بذاتِ خود بہت ہی تیزی سے اوپن ہوتا ہے

۱۱۔ Multi-browsing سپورٹڈ ہے یعنی ہر Tab ایک نئے براؤزر کے طور پر کام کرتی ہے اور ایک Tab خراب ہونے پر دوسری Tab پر کوئی اثر نہیں پڑتا

۱۲۔ Chrome 7 کا اپنا Video Player ہے جو کہ HTML5 کی وڈیو کو چلاتا ہے

۱۳۔ Flash مکمل طور پر سپورٹڈ ہے جبکہ Silverlight کا ورژن 4 سپورٹڈ ہے

۱۴۔ انتہائی اعلیٰ قسم کی سیکورٹی Chrome 7 میں مہیا کی گئی ہے

۱۵۔ Chrome 7 میں HTML5 & CSS3 بہت اچھی طرح سپورٹڈ ہیں

۱۶۔ javascript کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے یعنی جاوا اسکرپٹ صحیح سپورٹڈ ہے

۱۷۔ WebKit کو استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی رفتار دگنی ہوگئی ہے

اور درج ذیل خصوصیات موجود نہیں:

۱۔ ActiveX

۲۔ RSS

۳۔ JPEG امیج فارمیٹ سپورٹڈ نہیں ہے۔

۳۔ Mozilla FireFox

Internet Explorer کی طرح اس میں بھی مندرجہ بالا ساری خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں اور چند اضافی خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ سپیڈ کے لحاظ سے Chrome سے دوسرے نمبر پر ہے

۲۔ دنیا کی تقریباً 28 مختلف زبانوں میں FireFox مارکیٹ میں موجود ہے

۳۔ تقریباً دنیا کے تمام نامی گرامی آپریٹنگ سسٹم (جن کی لسٹ اوپر بھی دی گئی ہے) پر Run ہوتا ہے

۴۔ Plugins میں Active-X,RSS,Atom وغیرہ سپورٹڈ نہیں ہیں

۵۔ FireFox کے ورژن 3.5 میں Privacy Mode شامل کیا گیا تھا جو تا حال سپورٹڈ ہے

۶۔ FireFox میں مختلف سکرین ریڈرز مثلاً JAWS وغیرہ بہتر طور پر کام کرتے ہیں

ذاتی مشاہدہ

اپنے ذاتی کمپیوٹر میں Windows 7 ہونے کی وجہ سے میں IE9 کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ میں ویب پیج ڈیزائن کرتے وقت نئی ٹیکنالوجیز مثلاً HTML5, CSS3 اور ECMA Script5 کا استعمال کرتا ہوں جو IE9 میں بالکل صحیح کام کرتی ہیں۔ اس کی اسی خصوصیت نے میرا دل موہ لیا ہے۔ جہاں تک میرا XP میں انٹرنیٹ surfing کا تعلق ہے تو میں Chrome 7 کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ Chrome بھی نئی ٹیکنالوجیز سپورٹ کرتا ہے اور میں نے اس میں جتنے بھی ویب پیجز اوپن کئے ہیں مجھے کسی بھی پیج میں مسئلہ درپیش نہیں آیا۔ ان دونوں کی غیر موجودگی میں، میں IE8 کو بہتر سمجھتا ہوں۔

☆.....☆.....☆

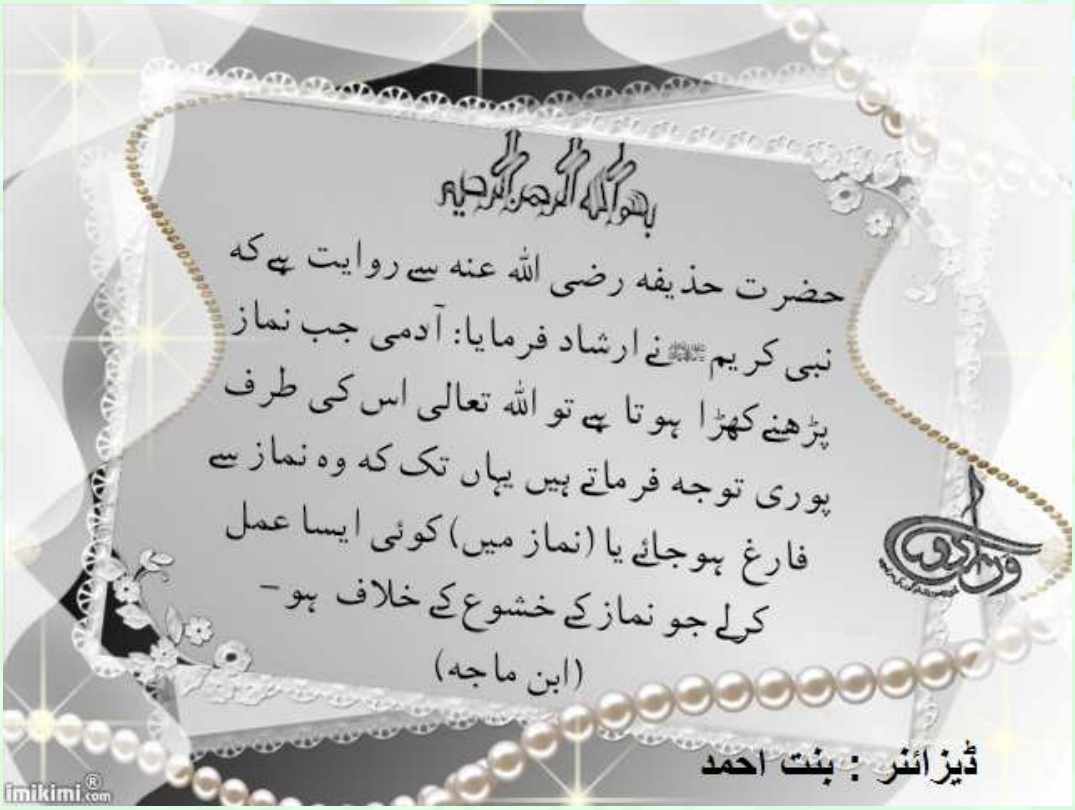

شہنشاہ جذبات

دلپسند سیال

پاکستان فلم انڈسٹری کے سنہرے دور کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو شہنشاہ جذبات محمد علی کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ محمد علی ایک بہت بڑے فنکار اور عظیم انسان تھے۔ انہوں نے اداکاری میں آنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ مکالمے بولنے کا انداز، آواز کے ذریعے مختلف جذبوں کا اظہار ادا کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ انہوں نے جو بھی کردار کیا اسے اپنی اداکاری اور جذبات بھرے مکالموں سے امر کر دیا۔ بعض فلموں میں بولے گئے ان کے جذبات بھرے مکالموں کو بہت شہرت ملی۔ جیسے فلم "انصاف اور قانون" میں ان کا بولا گیا لافانی مکالمہ "جج صاحب مجھے رہائی نہیں چاہیے۔ اگر رہائی دیتے ہو تو پھر میرے بارہ برس واپس لوٹا دو، میری جوانی واپس لوٹا دو" ان کی جذبات سے بھری آواز میں ادا کیے ہوئے یہ مکالمے دل پر اثر کرتے ہیں۔

انڈین فلم انڈسٹری اگر اداکار دلیپ کمار (یوسف خان) پر فخر محسوس کرتی ہے تو پاکستان فلم انڈسٹری کو اداکار محمد علی پر ناز ہے۔

محمد علی منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے کرم کی نوازشیں کیں تو پھر عزت، دولت، شہرت ان کے گھر کی باندی بن گئی۔

محمد علی 19 اپریل 1931ء میں بھارت کے شہر رام پور میں پیدا ہوئے۔ چار بہن میں وہ سب سے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے بھائی ارشاد علی تھے۔ محمد علی ابھی تین سال کے تھے کہ ان کی والدہ فوت ہو گئیں۔ ان کے والد سید مرشد علی نے ان کی پرورش کی خاطر دوسری شادی نہیں کی حالانکہ اس وقت ان کی عمر 35 برس تھی۔

محمد علی کا خاندان بہت مذہبی تھا۔ ان کے ہاں انگریزی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ محمد علی کے والد سید مرشد علی بہت بڑے دینی عالم تھے۔ محمد علی نے 14 سال تک اسکول کی شکل نہ دیکھی وہ صرف مدرسے میں اردو، عربی، فارسی وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

1943ء میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے ملتان آ گئے۔ ملتان کی گڑمنڈی کی ایک مسجد میں محمد علی اپنے والد کے ساتھ 12 سال رہے۔ اس مسجد میں ان کے والد خطیب تھے۔

ملتان آنے کے کچھ عرصے بعد سید مرشد علی کی سوچ میں تبدیلی آئی کہ وقت کے ساتھ چلنے کے لیے انگریزی تعلیم ضروری ہے اس لیے انہوں نے 1949 میں محمد علی کو اسلامیہ اسکول ملتان میں داخل کرا دیا۔ ان کا ساتویں کلاس میں داخلہ ہوا اس کے ایک برس بعد ملت ہائی اسکول ملتان میں انہیں نویں کلاس میں داخلہ مل گیا۔

محمد علی کے خاندان کے زیادہ تر لوگ حیدر آباد سندھ میں رہتے تھے اس لیے 1955ء میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ اور سٹی کالج حیدر آباد سے انٹر پاس کیا۔

محمد علی کو پائلٹ بننے کا شوق تھا اور وہ پائلٹ بن کر ایئر فورس جوائن کرنا چاہتے تھے۔ مگر معاشی حالات تنگ تھے ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ ایبٹ آباد جا کر ٹریننگ حاصل کر سکیں۔

انہیں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ ذریعہ معاش کے لیے انہوں نے کوئی کام کرنے کا سوچا۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی ارشاد علی ریڈیو پاکستان حیدر آباد میں بطور ڈرامہ آرٹسٹ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈائریکٹر قیوم صاحب سے محمد علی کا تعارف کرایا۔ اچھی اور بھرپور آواز کی وجہ سے انہیں ریڈیو پر نوکری مل گئی۔ ابتداء میں بچوں کے پروگرام کیے، بعد میں دیگر پروگرام بھی کیے، اور ریڈیو ڈراموں میں صداکاری بھی کرتے رہے۔

اس وقت ایک ڈرامے کی صداکاری کے دس روپے ملا کرتے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے ریڈیو پاکستان بہاولپور سے بھی پروگرام کیے۔

ان کی آواز سن کر ریڈیو پاکستان کے جنرل ڈائریکٹر ذوالفقار احمد بخاری المعروف زیڈ۔ اے بخاری صاحب نے انہیں کراچی بلا لیا۔ سونے کو کندن بنانے میں زیڈ۔ اے بخاری مرحوم کا بہت ہاتھ تھا۔ انہوں نے محمد علی کو آواز کے اتار چڑھاؤ، مکالموں کی ادائیگی، جذبات کے اظہار کا انداز بیاں اور مائکروفون کے استعمال کے تمام گر سکھا دیئے۔

زیڈ۔ اے بخاری نے ان کی آواز کی وہ تراش خراش کی کہ صداکاری میں کوئی ان کا مدمقابل نہ رہا۔

محمد علی کی فلمی زندگی

ریڈیو پر ان کی آواز سن کر متاثر ہونے والے پاکستان کے مشہور فلم ساز، ہدایتکار، پروڈیوسر، مصنف اور شاعر فضل کریم فضلی نے انہیں اپنی پہلی فلم "چراغ جلتا رہا" میں کام کرنے کی پیشکش کی جسے انہوں نے قبول کر لی۔ اس فلم میں انہوں نے بطور ولن کام کیا۔

"چراغ جلتا رہا" 1962ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم کا افتتاح کراچی کے نشاط سینما میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ فلم زیادہ کامیاب نہ ہو سکی مگر محمد علی کی اداکاری اور مکالمے بولنے کے انداز نے دوسرے فلم سازوں اور ہدایتکاروں کو ضرور متوجہ کر لیا۔ فلم "چراغ جلتا رہا" ایک تاریخ ساز فلم تھی وہ اس لیے کہ اس کی زیادہ تر کاسٹ نئی تھی۔ فضلی صاحب کی بھی یہ پہلی فلم تھی جبکہ محمد علی، کمال ایرانی، زیبا اور دیبا نے اسی فلم سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ جبکہ اس فلم کے ہیرو عارف کی بھی یہ پہلی فلم تھی جو کہ آخری ثابت ہوئی۔

"چراغ جلتا رہا" کے بعد محمد علی نے ابتدائی پانچ فلموں میں بطور ولن کام کیا جن میں ہدایتکار منور رشید کی فلم "بہادر"، ہدایتکار اقبال یوسف کی فلم "دال میں کالا" اور ہدایتکار جاوید ہاشمی کی فلم "دل نے تجھے مان لیا" قابل ذکر ہیں۔

حمد علی کو شہرت 1963ء میں عید الاضحی پر ریلیز ہونے والی ہدایتکار رفیق رضوی کی فلم "شرارت" سے ملی۔ "شرارت" نے سلور جوبلی منائی۔

اس فلم میں اکمل، محمد علی، حبیب، نغمہ، فردوس پہلی بار اکٹھے ہوئے تھے۔ مرکزی رول اکمل مرحوم نے ادا کیا تھا اور کیا خوب کیا تھا۔ محمد علی کا اس فلم میں ڈبل رول تھا اور انہوں نے دونوں کرداروں سے انصاف کیا۔ اس فلم کا ایک گانا جو محمد علی نغمہ اور حنا پر پکچرائز ہوا تھا بڑا خوبصورت گیت تھا۔ جو ریڈیو پاکستان سے نہ جانے ایک دن میں کتنی بار بجتا تھا۔ گانے کے بول تھے۔ "حال کیسا ہے جناب کا"۔ فلم کا ایک اور گیت جو نغمہ بیگم پر پکچرائز ہوا تھا "دل لے کے نہ دل تڑپانا" گلوکارہ مالا کے بہترین گانوں میں شمار ہوتا ہے۔

جولائی 1964ء میں ریلیز ہونے والی ہدایتکار رفیق رضوی کی فلم "خاموش رہو" سے محمد علی کو وہ شہرت ملی کہ ہر طرف ان کا نام گونجنے لگا۔ ان کی اداکاری کے چرچے ہونے لگے۔ "خاموش رہو" بطور ہیرو ان کی پہلی فلم تھی۔ محمد علی کی کامیابیوں کا سلسلہ اسی فلم سے شروع ہوا اس فلم میں محمد علی کو مشکل اور چیلنجنگ کردار ملا یہ محمد علی کی فنی زندگی کا پہلا چونکا دینے والا کردار تھا اور انہوں نے اس کردار کو اس طرح پرفارم کیا کہ فلم بین عش عش کر اُٹھے۔ اس کے بعد محمد علی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور وہ مقام حاصل کیا جو ایک خواب لگتا ہے۔ اس فلم کا ایک ڈائیلاگ جو آج تک فلم بینوں کو یاد ہے۔ "قیامت تک چپ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ جج صاحب لیکن اب تو قیامت بھی سر سے گزر چکی ہے۔" جب محمد علی نے اپنی گرجدار آواز میں یہ ڈائیلاگ ادا کیے تو وہ face expression کے ایسے لاثانی تاثرات پیش کر رہے تھے جس پر نقاد حیرت زدہ تھے۔ ایک نیا اُبھرتا ہوا فنکار فنِ اداکاری کی اُس معراج پر نظر آرہا ہے جہاں برصغیر میں آج تک کوئی دیکھنے میں نہیں آیا۔

1965ء میں ریلیز ہونے والی ہدایتکار حسن طارق کی فلم "کنیز" گولڈن جوبلی فلم تھی۔ اس فلم میں ہدایت کار حسن طارق نے انڈین فلم "انداز" سے متاثر ہو کر محمد علی، وحید مراد اور زیبا کو پہلی بار یکجا کیا، جس طرح دلیپ کمار نے ولن ہونے کے باوجود راج کپور پر برتری حاصل کی، بالکل اسی طرح محمد علی نے معاون اداکار ہونے کے باوجود وحید مراد کے مقابلے میں "پہلا بہترین اداکار" کا ایوارڈ حاصل کر کے دھوم مچادی اور فلم نگر کے طول و عرض میں محمد علی کے چرچے ہونے لگے۔

دسمبر 1965ء میں ریلیز ہونے والی فلم "مجاہد" سلور جوبلی فلم تھی۔ اس فلم میں محمد علی، لالہ سدھیر اور دیبا پہلی بار اکٹھے ہوئے اس فلم میں محمد علی نے ایک پیشہ ور سپاہی کا کردار ادا کیا تھا جو روزگار کے حصول کے لیے دشمنوں کی فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے مگر اپنوں کو نقصان سے بھی بچانا چاہتا ہے۔ اس فلم میں بھی محمد علی کی اداکاری شاندار رہی خاص کر فلم کے اُس سین میں جب اُن کا بازو کٹ جاتا ہے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس فلم کا ایک ترانہ "جاگ اُٹھا ہے سارا وطن ساتھیوں مجاہدو" بڑا مقبول ہوا۔

مئی 1966ء میں ریلیز ہونے والی فلم "آگ کا دریا" گولڈن جوبلی فلم تھی۔ ڈاکوؤں کے موضوع پر بنائی گئی اس فلم کے ڈائریکٹر ہمایوں مرزا تھے۔ اس فلم میں محمد علی نے "دلاور ڈاکو" کے رول میں ایسی نیچرل و متاثر کن پرفارمنس دی کہ اس کردار اور فلم کے چرچے پاکستان ہی میں نہیں بلکہ بھارت میں بھی ہونے لگے۔ پاکستان کی 60 سالہ فلمی تاریخ میں آج تک ڈاکو کا کردار محمد علی سے اچھا اور کوئی اداکار نہیں کر سکا اس فلم کا ایک ڈائیلاگ "طوائف ناچو اور اتنے زور سے ناچو کہ تمہاری ہڈیاں گھنگروؤں کی طرح بجنے لگیں۔" جسے ریاض شاہد نے لکھا تھا بڑا مقبول ہوا۔ سنیل دت نے ڈاکو کا کردار بھارتی فلم "مجھے جینے دو" میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ محمد علی کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ حالانکہ "مجھے جینے دو" سنیل دت کی زندگی کی بہترین فلم ہے۔ غرضیکہ "آگ کا دریا" میں محمد علی نے ڈاکو کے کردار کو اس قدر خوبصورت انداز میں پیش کیا کہ اس کے بعد ڈاکو کا کردار کرنے والے فنکار اسے ہی کاپی کرتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ "آگ کا دریا" ہر اعتبار سے ایک مکمل، بے عیب فلم تھی، موضوع، کہانی، مکالمے، موسیقی، اداکاری، ہدایت کاری، فوٹو گرافی سب ہی پہلو سے یہ ایک انتہائی معیاری فلم تھی یہی وجہ ہے کہ اس فلم کو کبھی بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

اکتوبر 1966ء میں ریلیز ہونے والی گولڈن جوبلی فلم "مادر وطن" محمد علی کی یادگار فلموں میں سے ایک ہے 1965ء کی پاک بھارت جنگ کا پس منظر رکھنے والی اس فلم میں محمد علی نے ایک فوجی کے کردار میں اعلیٰ پائے کی پرفارمنس دی ہے۔ اس فلم کا ایک گیت جسے نسیم بیگم مرحومہ نے گا کر اپنے آپ کو فن کی دنیا میں امر کر لیا ہے۔ یہ گانا آج بھی کانوں میں رس گھولتا اور خون میں ولولہ پیدا کرتا ہے۔ "اے راہِ حق کے شہیدو وفا کی تصویرو تمہیں وطن کی فضائیں سلام کہتی ہیں۔"

دسمبر 1966 میں ریلیز ہونے والی ہدایتکار شباب کیرانوی کی فلم "آئینہ" گولڈن جوبلی فلم تھی۔ جس میں محمد علی دیبا اور منور ظریف نے شاندار پرفارمنس کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس فلم کا ایک گیت "تم ہی ہو محبوب میرے میں کیوں نہ تمہیں پیار کروں" فلم "ارمان" کے گانے "اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم" کے بعد اب تک ریڈیو پاکستان کے سب سے زیادہ نشر ہونے والے گانوں میں شامل ہے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ منور ظریف پر پکچرائز ہوا گیت "مولا جٹ پٹ سے ہیرو بنادے مجھے" نے بھی اس فلم کی کامیابی کو چار چاند لگائے۔

ستمبر 1968ء میں ریلیز ہونے والی ہدایتکار لئیق اختر کی فلم "صاعقہ" گولڈن جوبلی اعلیٰ ترین معیار کی گھریلو نغمہ بار فلم تھی۔ جس میں محمد علی نے بڑے غضب کی اداکاری کی اور نگار ایوارڈ کے حقدار بنے اس فلم کا ایک گیت جو محمد علی اور شمیم آرا پر پکچرائزڈ ہوا تھا۔ Worth seeing ہے۔ "اے بہارو گواہ رہنا دو دلوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسم کھائی ہے۔" یہ اداکارہ شمیم آرا کی ذاتی فلم تھی۔ جو روس میں مسلسل دو سو ہفتے تک چلتی رہی اور لالہ سدھیر کی فلم "باغی" کا بیرونی ممالک میں چلنے کا ریکارڈ توڑا۔

جنوری 1969ء میں ریلیز ہونے والی ہدایتکار اقبال یوسف کی فلم "تم ملے پیار ملا" وہ فلم ہے جس کی شوٹنگ کے دوران محمد علی اور زیبا علی زیب بن گئے یعنی دونوں نے شادی کر لی۔ شادی کے اگلے دن اخبارات کے ذریعے علی زیب کی شادی کی خبر پورے ملک میں جنگ کی آگ کی طرح پھیل گئی۔اس وقت بے شمار لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شادی کامیاب نہ ہو سکے گی اور جلد ہی ختم ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ شادی اس قدر کامیاب ہوئی کہ دوسروں کے لیے مثال بن گئی۔اس فلم کا ایک گیت "آپ کو بھول جائیں ہم اتنے تو بے وفا نہیں" نور جہاں اور مہدی حسن کے اچھے گانوں میں شمار ہوتا ہے۔"یہ حسین وادیاں یہ سماں"،"گوری کے سر پہ سج کے سہرے کے پھول کہیں گے تم ملے پیار ملا"۔ یہ فلم انڈین فلم "چوری چوری" سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ "چوری چوری" میں محمد علی اور زیبا والا کردار راج کپور اور نرگس نے کیا۔ یہ سچ ہے کہ علی زیب ،راج کپور اور نرگس سے بہتر پرفارمنس پیش نہ کر سکے۔

فلم "جیسے جانتے نہیں" علی زیب پروڈکشن کی پہلی فلم تھی۔ جو اداکار رنگیلا کی بطور ہدایتکار اور مصنف پہلی فلم "دیا اور طوفان" کے مقابلے میں پیش ہوئی۔ فلم نگر کے لوگوں نے رنگیلا کو مشورہ دیا کہ وہ علی زیب کی فلم کے سامنے اپنی پہلی فلم ریلیز نہ کریں لیکن رنگیلا بضد تھے کہ وہ اپنی فلم کو مقررہ تاریخ پر ہی ریلیز کریں گے خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ رنگیلا کی فلم سپر ہٹ ہوئی اور علی زیب کی فلم تمام خوبیوں کے باوجود ناکام رہی۔اس فلم کا ایک گیت جو محمد علی پر پکچرائز ہوا تھا بہت خوبصورت گیت تھا"کہنے کو تو ہے سہاگ رات لیکن ایسی رات اللہ کسی کو نہ دکھائے۔"

فلم "بہاریں پھر بھی آئیں گی" گلوکارہ مالا بیگم کی بہن شمیم نازلی کی یہ ذاتی فلم تھی۔ جس میں محمد علی اور زیب نے ہیرو،ہیروئن کے کردار ادا کئے یوں تو اس فلم کے سارے گانے پاپولر ہوئے لیکن جس دوگانے کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے،"خوش نصیبی ہے میری تم نے اپنایا ہے۔"

1970 میں ریلیز ہونے والی ہدایتکار شباب کیرانوی کی فلم "انسان اور آدمی" ایک لازوال فلم تھی۔ محمد علی کے لازوال فن سے صحیح معنوں میں جس ہدایت کار نے فائدہ اُٹھایا وہ شباب کیرانوی تھے۔ جنہوں نے اپنی فلموں میں محمد علی سے ایسی دلکش کردار نگاری کروائی جس کی نظیر نہیں ملتی،"انسان اور آدمی" بلا شک و شبہ محمد علی اور زیبا کی مشترکہ شہرہ آفاق فلم تھی۔ جس فلم میں دونوں صحیح معنوں میں فن کی معراج پر پہنچے اور اکیڈمی آف ایکٹنگ قرار پائے۔ اس فلم کی آخری ریل میں محمد علی نے مکالمات کی جداگانہ ادائیگی اور لازوال پرفارمنس سے فلم بینوں کو اتنا متاثر کیا کہ اُن کے آنسو بہہ نکلے یہی اس فنکار کی عظیم ترین کامیابی تھی۔ جب یہ فلم چین میں ریلیز ہوئی تو اترنے کا نام نہیں لیتی تھی۔اس فلم سے متاثر ہو کر چین والوں نے علی زیب کو چین آنے کی دعوت دی جسے انہوں نے بخوشی قبول کیا۔ "انسان اور آدمی" اصل میں انڈین فلم "مامتا" کا چربہ تھی جس میں محمد علی کا کردار آشوک کمار نے کیا۔ جن لوگوں نے انڈین فلم مامتا دیکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ عظیم اداکار آشوک کمار کسی بھی سین میں "انسان اور آدمی" والے محمد علی کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکتے۔اس فلم کے سارے گانے سپر ہٹ ہوئے لیکن مہدی حسن اور نور جہاں کا گانا زبان زد عام ہوا۔ "تو جہاں کہیں بھی جائے میرا پیار یاد رکھنا"، "ہم نے تم سے پیار کیا تھا"، "خط پڑھ کے اب دل دھڑکتا نہیں سا جنا۔"

فلم "انصاف اور قانون" ہدایتکار شباب کیرانوی کی یادگار فلموں میں سے ایک ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ علی زیب کسی اور فلم میں کام نہ بھی کرتے تو بھی انہیں عظیم اداکار ثابت کرنے کے لیے یہی ایک فلم کافی تھی۔اس فلم کا ایک مکالمہ "جج صاحب سفینہ میری روح کی آواز ہے۔ میں سفینہ سے محبت کرتا تھا کرتا ہوں اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا اور دنیا کی کوئی طاقت میری اس روح کی آواز کو دبا نہیں سکتی۔"

فلم میں محمد علی کو مجرم قرار دے کر 12 سال کی سزا سنادی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ بے گناہ ہوتے ہیں لیکن جب اصل مجرم پکڑا جاتا ہے تو عدالت انہیں رہا کر دیتی ہے تب محمد علی عدالت میں کھڑے ہو کر جج کو پکار پکار کر کہتے ہیں۔ "مجھے رہائی نہیں چاہیئے جج صاحب مجھے میرے بارہ سال لوٹا دو، مجھے میری جوانی لوٹا دو۔" یہ مکالمے آج بھی ہر پاکستانی کے دل میں نقش ہیں۔اس منظر میں محمد علی نے اپنی اداکاری کا لوہا دشمنوں سے بھی منوایا اس فلم کے دو گیت بڑے خوبصورت تھے۔

"تو اگر برا نہ مانے تجھے پیار میں سکھا دوں"،"سو برس کی زندگی میں ایک پل۔"

فلم "وحشی" محمد علی کی وہ مشہور زمانہ فلم تھی جس میں محمد علی نے بردہ فروش یعنی بچے اغواء کرنے والے کا کردار بڑی مہارت سے ادا کیا عدالت والے سین میں محمد علی واقعی فن کی معراج پر تھے اور انہو ں نے اتنے اچھے ایکسپریشنز دیئے کہ لوگوں کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں واہ کیا فلم تھی۔ مسعود رانا کا گایا ہوا گانا "جو ٹھنڈک لوٹے مائوں کی۔"

ہدایتکار ایس سلیمان کی فلم "محبت" ایک اچھی فلم تھی۔ جس میں علی زیب فن کی بلندیوں پر تھے یہ پہلا موقع تھا کہ اس فلم میں زیبا بیگم نگار ایوارڈ کی حق دار ٹھہریں جبکہ محمد علی کو نظر انداز کر دیا گیا اور ندیم کو "احساس" فلم کے بہترین اداکار کا ایوارڈ دیا گیا۔ چونکہ فلم "احساس" نگار اخبار کے بانی الیاس رشیدی کی ذاتی فلم تھی۔ فلم "محبت" کا میوزک بڑا زبردست تھا۔ "خدارا محبت نہ کرنا، محبت کرو گے تو آہیں بھرو گے"،"رنجش ہی سہی"،"یہ محفل جو آج سجی ہے اس محفل ہم سا ہو تو سامنے آئے۔"

مشہور صحافی، فلم ساز اور ہدایتکار علی سفیان آفاقی کی فلم "آس" ایسی فلم ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔اس فلم میں محمد علی اور شبنم نے اعلیٰ پائے کی اداکاری کی اور دونوں ہی ایوارڈ کے حقدار ٹھہرے فلم کے کلائمکس سین میں جب محمد علی کہتے ہیں کہ "میری جنم جنم کی آس پوری ہو گی" محمد علی نے فن کی حدوں کو چھو لیا تھا۔ یہ محمد علی اور شبنم کی وہ فلم تھی جس پر اخبار لکھا کرتے تھے کہ یہ

کسی پبلسٹی کا محتاج نہیں۔اس فلم کے سبھی گانے مشہور ہوئے لیکن "بول ری گڑیا بول ذرا" کا تو جواب ہی نہیں۔

فلم "دامن اور چنگاری" ہدایتکار شباب کیرانوی کی کامیاب میوزیکل اور گھریلو فلم تھی، منور ظریف اور علاوالدین نے بہترین کردار نگاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ خاص طور پر مہدی حسن کے گانے "ہمارے دل سے مت کھیلو کھلونا ٹوٹ جائے گا" کی پکچرائزیشن پر محمد علی نے غضب کی اداکاری کی اور دلیپ کمار کے گانے "اے میرے دل کہیں اور چل" فلم داغ اور پیتے پیتے کبھی کبھی فلم بیراگ اور مجھے دنیا والو شرابی نہ سمجھو فلم لیڈر اور راجیش کھنہ کی فلم دو راستے (یہ ریشمی زلفیں یہ شربتی آنکھیں) اور فلم کٹی پتنگ (یہ جو محبت ہے یہ ان کا ہے کام) کو پیچھے چھوڑ دیا۔ میڈم نور جہاں تو اس صدی کی بہترین گلوکارہ تھیں یوں تو ہر فلم میں انہوں نے بہترین گلوکاری کا مظاہرہ کیا ہے لیکن اس فلم میں اُن کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور انہوں نے بڑی میٹھی اور سریلی آواز میں اس فلم کے گانے گائے، جو روزِ اول کی طرح آج بھی اُسی طرح کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ "سہیلی تیرا بانکپن لٹ گیا آئینہ توڑ دے"، "دیس پرائے جانے والے وعدہ کرتے جانا"، "اصلی چہرے پر ہم نے بھی نقلی چہرہ سجا لیا" اور "ایک ہاتھ پر سورج رکھ دو ایک ہاتھ پر چاند۔"

فلم "دل اک آئینہ" ہدایتکار شباب کیرانوی کی بڑی خوبصورت فلم تھی۔ جس میں محمد علی نے ایک مغرور نواب کا کردار ادا کیا جو اپنی بیوی کو بے انتہا چاہتا ہے مگر اس کی بیوی بیٹی کو جنم دے کر مر جاتی ہے محمد علی بیٹی کو بیوی کی موت کا باعث جان کر اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں ایک "سنگدل باپ" کا رول میں محمد علی نے حقیقت کا ایسا رنگ بھرا کہ یہ کردار فلم کی بجائے حقیقت معلوم ہوتا ہے اور یہی اس فنکار کا خاصہ تھا کہ وہ ایسے کردار فی گہرائی میں ڈوب کر کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی بھی کرداروں کا محتاج نہیں رہے بلکہ کردار ہمیشہ ان کے محتاج رہے۔

ہدایت کار اقبال اختر کی زندگی کا نچوڑ 1973ء میں ریلیز ہونے والی فلم "پھول میرے گلشن کا" گولڈن جوبلی فلم تھی۔ یہ وہ دور تھا جب علی زیب فلمی صنعت میں شہرت و مقبولیت کی بلندیوں پر فائز تھے اور ہر طرف ان کی فلموں کے چرچے تھے اور فلم بین چاہے وہ مرد ہوں یا خواتین وہ سب میں یکساں مقبول تھے۔ یہ علی زیب کی اداکاری کی انتہا تھی کہ جب اس فلم کا شو ختم ہوتا تو لوگ روتے ہوئے سینما سے باہر آتے تھے۔اس فلم کے ایک منظر میں جب محمد علی ڈاکٹر کو کہتے ہیں "آپ میری ساری دولت لے لیں لیکن میرے بچے کو بچا لیں" اس منظر میں محمد علی نے اتنی جذباتی کردار نگاری کی کہ آج تک کوئی دوسرا اداکار اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکا۔ اسی فلم کے ایک اور منظر میں جب نشو کی آنکھوں سے پٹی کھلتی ہے تو وہ کہتی ہے "مجھے سب نظر آرہے ہیں" منا "کہاں ہے تو" زیبا اسے کہتی ہے کہ "منے" کی آنکھوں سے تم دیکھ رہی ہو، منا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔رلا دینے والے سین تھے۔اس فلم میں محمد علی نے وحید مراد اور ندیم کو کسی بھی جگہ پَر نہیں مارنے دیئے اور پوری فلم پر حاوی رہے اس فلم کے سب ہی گانے مشہور ہوئے۔"تو ہے پھول میرے گلشن کا"، "تو ہی بتا پگلی پون"، بلاشبہ "پھول میرے گلشن کا" ایک اعلیٰ ترین معیار کی سپر کلاس فلم تھی جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

فلم "عورت ایک پہیلی" علی زیب کی یادگار فلموں میں سے ایک ہے۔اس فلم میں محمد علی کی بیوی کا کردار زیبا نے کیا جسے وہ کسی بدگمانی میں آکر گھر سے نکال دیتے ہیں اور سنگیتا سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ فلم کے آخر میں تھپڑوں کا خوب تبادلہ ہوتا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ہدایتکار ایم۔اے رشید کی فلم "آدمی" سلور جوبلی فلم تھی۔ جس میں محمد علی، وحید مراد، کویتا اور نشو نے اچھا کام کیا تھا اور خاص کر محمد علی جب عدالت میں کھڑے ہو کر جج (طالش) سے کہتے ہیں کہ جج صاحب اس دنیا میں ایک آدمی کے پاس لاکھوں روپے ہیں اور لاکھوں انسانوں کے پاس کچھ بھی نہیں، ایسا کیوں ہے؟ اور پھر جب محمد علی کو پھانسی ہو جاتی ہے۔جج جو کہ فلم میں محمد علی کا باپ ہوتا ہے کہتا ہے "میرے بیٹے تو بچپن میں بھی کھلونوں کے لیے ضد کیا کرتا تھا آج پھانسی کا پھندا بھی تو نے ضد کر کے لے لیا ہے" یہ سین دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ہدایتکار شباب کیرانوی کی میگا ہٹ فلم "آئینہ اور صورت" میں محمد علی کو لاچہ کرتا پہنا کر وہ پرفارمنس لی جس کا لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے اور ثابت کیا کہ مشکل سے مشکل کردار بھی محمد علی کی فنی راہ میں رکاوٹ نہیں۔انہوں نے سیدھے سادھے پینڈو ممدو کے کردار میں ایسا کام کیا کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ نگار ایوارڈ کی جیوری کے تمام کے تمام ممبر محمد علی کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور ہو گئے اور محمد علی کو نگار ایوارڈ ملا۔

فلم "نوکر" ہدایتکار شباب کیرانوی کی ایک مزاحیہ فلم تھی۔ جس میں علی زیب کی اداکاری بڑی شاندار تھی۔اس فلم کا ایک گیت "پنا جیون شیشے کا کھلونا ہی تو ہے" مہدی حسن کے بہترین گانوں میں شمار ہوتا ہے۔ محمد علی نے نوکر میں ایک بار پھر اپنے انداز سے چونکا دیا تھا یعنی ایک جذباتی فنکار مزاحیہ کردار نگاری کرے تو دیکھنے والے کو حیرت انگیز خوشی ہوتی ہے۔ یہ محمد علی کا خاصا تھا کہ وہ ہر کردار میں دیکھنے والے کو اپنی کردار نگاری کے سحر میں جکڑ لیتے تھے۔

اس فلم میں محمد علی نے اداکار ننھا کے نوکر کا کردار کیا۔ محمد علی اداکار ننھا کی مالش کرتے ہوئے ایک مزاحیہ پروڈی گانا گاتا ہے "میں نوکر تیرا توں مالک میرا" بہت مشہور ہوا تھا۔

لوک داستان پر مبنی ہدایتکار شریف نیئر کی فلم "شیریں فرہاد" بھی ایک یادگار فلم ہے۔ یہ محمد علی کے عروج کا دور تھا اور وہ ہر کردار میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ نظر آتے لہٰذا محمد علی نے شریف نیئر اور عوام کو مایوس نہیں کیا اور فرہاد کے کردار میں ڈوب کر کردار نگاری کی اس فلم کو موسیقارِ اعظم بقول نور جہاں "ایسے موسیقار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں" خواجہ خورشید انور تھے۔ جنہوں نے فلم کا بڑا اچھا میوزک دیا تھا اس فلم کے سبھی گانے مشہور ہوئے چند ایک کا ذکر کرتا ہوں "عشق میرا دیوانہ، یہ دیوانہ مستانہ"، "شیریں

شیریں جانے فرہاد" وغیرہ۔

فلم "ان داتا" پاکستان کی نمبر ون ایکشن میگا کاسٹ سپر ہٹ فلم تھی۔ جس میں لالہ سدھیر تو خیر فن کی معراج پر تھے۔ محمد علی سلطان راہی کے کردار بھی بڑے زبردست تھے۔اُن میں اداکاری کا بڑا مارجن تھا۔ آفرین ان دونوں فنکاروں نے اپنے کرداروں میں جان ڈال دی تھی اور ہر کوئی پرستار خواہ وہ لالہ سدھیر کا ہو یا محمد علی کا ہو یا پھر سلطان راہی کا وہ یہی کہتا تھا کہ میرے پسندیدہ فنکار کی یہ بہترین فلم ہے۔

فلم "سنگرام" ہدایت کار اقبال یوسف کی ایک سپر ہٹ فلم تھی جس میں محمد علی نے کھل کر کام کیا اور ڈاکو کے رول میں ایسی بہترین کردار نگاری پیش کی جو لوگوں کے دلوں پر پیوست ہو گئی اور اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود لوگ ابھی بھی محمد علی کی اداکاری کو نہیں بھلا سکے۔ سنگرام پاکستان کی پہلی فلم تھی جس میں محمد علی نے اپنے اصل نام سے کام کیا۔ ہندو سنگرام مسلمان ہو کر محمد علی بن جاتا ہے۔ محمد علی کے اسلامی کردار سے متاثر ہو کر سندھ کا ایک خاندان مسلمان ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ فنکار وہی جو کردار میں ڈھل جائے پاکستان میں فنکاری کا یہ ہنر محمد علی سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔

فلم "بھروسہ" علی زیب کی وہ مشترکہ فلم تھی جو سب سے زیادہ کامیاب، سپر ہٹ اور ہفتوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ چلنے والی فلم تھی۔ شباب گروپ کی اس فلم بھروسہ میں علی زیب کے بعد نھا اور تمنا کا پیئر بھی بڑا اچھا رہا اور اس پیئر نے لوگوں کو ہنسا ہنسا کے بے بس کر دیا۔

فلم "حیدر علی" پاکستانی فلمی تاریخ کی سب سے عظیم یادگار اور بہترین فلم ہے۔ جس طرح عوامی اداکار علاوالدین نے فلم "کرتار سنگھ" کے مرکزی کردار میں اکمل مرحوم نے ملنگی میں، سدھیر نے ماں پتر میں، یوسف خاں نے ضدی میں، نغمہ نے مکھڑا چن ورگا میں اور فردوس نے فلم ہیر رانجھا میں ہیر کا مرکزی کردار ادا کر کے اپنے آپ کو امر کر لیا۔ محمد علی نے "حیدر علی" کے ٹائٹل رول میں ماضی کو تاریخ سے نکال کر فلم بینی کی تاریخ میں امر بنا دیا اُن کے اس کردار کو خود "حیدر علی" بھی اگر دیکھ لیتے تو وہ بھی شک کا شکار ہو جاتے کہ "حیدر علی" وہ ہیں یا محمد علی۔ گٹ اَپ، چال ڈھال، لب و لہجہ، قد کاٹھ غرض یہ کہ ہر لحاظ سے انہوں نے اتنی اچھی پرفارمنس پیش کی جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ محمد علی یہ کردار کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور فلم دیکھتے ہوئے لوگ ایسے مگن ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "حیدر علی" دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔

فلم "تیرے بنا کیا جینا" میں محمد علی نے ایسے باپ کا کردار ادا کیا جو امیر ترین شخص ہے اور اپنی اکلوتی بیٹی سے بے حد پیار کرتا ہے۔ محمد علی نے اپنی لازوال پرفارمنس، فیس امپریشن اور اعلیٰ ترین کارکردگی سے باپ بیٹی کے کردار کو اس طرح اُجاگر کیا کہ حقیقی زندگی میں شاید کوئی باپ ایسا نہ کر سکا ہو۔ یوں یہ کردار اُن کی فنی زندگی کا یادگار اور مشکل ترین کردار تھا جو محمد علی کی اعلیٰ ترین شخصیت اور نفیس ترین پرفارمنس کی بدولت امر ہو گیا۔ یہ بات عیاں ہے کہ جب بھی فلمی صنعت میں کوئی مشکل اور منفرد کردار تخلیق کیا گیا اس کے لیے محمد علی فلمساز کی پہلی چوائس ہوا کرتے تھے۔ چودھری تصدق حسین سیال نے بھی جب "مراد خاں سیال" کے نام سے فلم بنانے کا سوچا تو وہ بھی سب سے پہلے علی زیب ہاؤس پہنچے اور انہوں نے محمد علی کو اس کردار کے لیے کافی حد تک راضی کر لیا لیکن زندگی نے ان کو مہلت نہ دی اور وہ یہ عظیم کردار نہ کر سکے۔ جب ریاض شاہد مرحوم نے فلم "ہلاکو" بنانے کا اعلان کیا تو انہوں نے محمد علی کو سامنے رکھتے ہوئے کہانی لکھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ریاض شاہد کو بھرپور جوانی میں اپنے پاس بلا لیا اور یہ کام صرف کاغذی کاروائی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خود محمد علی کہتے تھے کہ اگر "ہلاکو" فلم بن جاتی تو وہ میری زندگی کی سب سے بڑی فلم ہوتی۔

فلم "دوریاں" کا شمار پاکستان کی بہترین فلموں میں ہوتا ہے۔ محمد علی اس فلم میں گورنر بنے اور ایسے بنے کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے اس فلم میں محمد علی اپنی چال ڈھال، قد کاٹھ، گفت و شنید غرض یہ کہ ہر انداز سے مکمل گورنر نظر آتے ہیں یہ کردار اُن کی پرسنالٹی سے بے حد میچ کرتا تھا لہٰذا اُنہوں نے اس منفرد کردار کو اعلیٰ ترین کارکردگی سے امر بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ محمد علی سے بہتر گورنر کا کردار پورے برصغیر میں کوئی دوسرا اداکار نہیں کر سکتا تھا۔ شتروگھن سنہا فلم "آندھیاں" میں گورنر بنے لیکن شتروگھن سنہا تو کیا اگر دلیپ کمار یا امیتابھ بچن بھی گورنر کا کردار کرتے تو وہ بھی محمد علی کے سامنے بے بس نظر آتے۔

فلم "چوری چوری" مشہور مزاحیہ شاعر اور ٹی وی اداکار اطہر شاہ جیدی کی پہلی ذاتی فلم تھی۔ یہ فلم علی زیب کی بہترین کردار نگاری کی بدولت گولڈن جوبلی ہوئی یہ فلم اپریل 1979ء کو ریلیز ہوئی جس دن قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر چڑھایا گیا اس کے باوجود یہ فلم سپر ہٹ رہی۔

فلم "جانے انجانے" یہ محمد علی کی وہ فلم ہے جو پاکستان اور بنگلہ دیش کے اشتراک سے بنی تھی۔ اس فلم نے بنگلہ دیش میں بنگالی فلموں کا ریکارڈ توڑ دیا اور مسلسل 88 ہفتے چل کر شاندار پلاٹینم جوبلی فلم کا اعزاز حاصل کیا چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر یہ فلم پاکستان میں ریلیز نہ ہو سکی جب فلم کی کامیابی کے بعد محمد علی بنگلہ دیش گئے تو ائیر پورٹ پر بنگالی عوام نے ان کا اتنا شاندار استقبال کیا جو بعض بڑے ملکوں کے سربراہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا یہی نہیں بلکہ لوگوں نے محمد علی کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا اور محمد علی زندہ باد کے ساتھ غالباً پہلی بار پاکستان زندہ باد کا نعرہ بنگلہ دیش میں سنائی دیا۔

ازدواجی زندگی

محمد علی اور زیبا کی پہلی فلم "چراغ جلتا رہا" تھی۔ اس فلم کے پہلے ٹیک سے ہی محمد علی زیبا کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ اسے وہ پہلی نظر کی محبت کہتے تھے۔ مگر یہ اور بات ہے کہ اپنی اس محبت کو کافی عرصہ اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ زیبا کو کسی اور کے ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھ کر برداشت نہ کر سکتے تھے۔ مشہور صحافی اور فلمساز علی سفیان آفاقی کی گولڈن جوبلی ہٹس فلم "کنیز" کی شوٹنگ کے دوران کافی دلچسپ صورت حال پیدا ہوتی رہی۔ فلم

کے ہیرو وحید مراد جبکہ ہیروئن زیبا بیگم تھیں۔ وحید مراد سمجھ گئے تھے کہ محمد علی زیبا سے محبت کرنے لگے ہیں اس لیے جان بوجھ کر زیبا کے ساتھ چپکے رہتے جس وجہ سے محمد علی کا پارہ چڑھتا رہتا اور وہ زیبا کو وحید مراد سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے سے منع کرتے تو زیبا چڑ کر کہتی "تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے" جواب میں محمد علی صاحب خاموش ہو جاتے مگر کافی دیر تک شوٹنگ رکی رہتی۔

محمد علی اپنی محبت کا اظہار کرنے میں اتنی دیر کر دی کہ ان کے درمیان اداکار لالا سدھیر ولن بن کر کود پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سدھیر نے زیبا کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائیں اور شادی کر کے زیبا کو لے اڑے اور محمد علی صاحب دیکھتے رہ گئے۔

لالا سدھیر پہلے ہی پنجابی فلموں کی مشہور ہیروئن "شمی" سے شادی کر چکے تھے اور ایک غیرت مند پٹھان ہونے کے ناتے اداکارہ شمی کو فلموں میں کام کرنے سے منع کر دیا تھا جس کی وجہ سے اداکارہ شمی فلموں سے کنارہ کشی کر کے ایک مکمل گھریلو عورت بن گی۔

لالا سدھیر نے زیبا کو بھی فلموں میں کام کرنے سے منع کر دیا۔ مگر زیبا نے اس پابندی کو قبول نہ کیا۔ کچھ فلمی دوستوں کی مدد سے وہ بھاگ کر لاہور واپس آ گئیں اور کچھ عرصے بعد ان میں طلاق ہو گئی۔

کراچی میں بننے والی فلم "تم ملے پیار ملا" کی شوٹنگ کے دوران ہی بروز جمعرات 29 ستمبر 1966ء کی سہ پہر تین بجے اداکار آزاد کے گھر واقع ناظم آباد میں محمد علی نے زیبا سے نکاح کر لیا، ان کا نکاح قاضی سید احتشام نے پڑھایا تھا، اور مہر کی رقم 37500 روپے رکھی۔ یہ شادی فلمی دنیا کی مثالی شادی ثابت ہوئی، اور جب عوام کو ان دونوں کی شادی کی خبر ملی تو انہیں بے حد خوشی ہوئی۔

محمد علی کی زیبا سے اتنی محبت تھی کہ انہوں نے مرتے دم تک زیبا کا ساتھ نبھایا۔ علی زیب نے ایک انتہائی خوش گوار بھرپور ازدواجی زندگی گزاری، کئی یادگار فلموں میں اپنی یادگاری کے جوہر دکھائے، نہ صرف پاکستان، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی علی زیب ایک قابل احترام جوڑی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ دونوں نے حج بھی کیا اور کئی عمرے بھی ادا کیے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے شمار دولت، عزت اور شہرت عطا کی، لیکن اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا۔

اس پر بھی محمد علی اللہ کے شکر گزار رہے، اور اس محرومی کو اللہ کی مصلحت قرار دیتے رہے۔

محمد علی نے زیبا کی بیٹی ثمینہ جو کہ لالا سدھیر سے تھی۔ اسے اپنی سگی بیٹی کی طرح پالا اسے اپنا نام دیا۔ اس کی شادی دھوم دھام سے کی پھر اس کی اولاد کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ وہ ایک اچھے شوہر، اچھے باپ اور اچھے نانا تھے۔

شادی کے بعد محمد علی اور زیبا نے "علی زیب" کے نام سے اپنا پروڈکشن ہاؤس قائم کیا اور "علی زیب" کے بینر تلے کافی اچھی اور کامیاب فلمیں بنائیں۔

یہ شاید واحد حقیقی میاں بیوی تھے جن کی فلمیں بہت کامیاب ہوتی رہی اور تماشائی ان میاں بیوی کو ہیرو اور ہیروئن کے روپ میں بھی قبول کرتے تھے ورنہ بہت سے حقیقی میاں بیوی کی فلمی جوڑیاں بری طرح پٹ چکیں تھیں۔ "علی زیب" کی جوڑی اتنی کامیاب تھی کہ انہوں تقریباً 75 فلموں میں اکٹھے کام کیا۔

محمد علی نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ زیبا ان کی پہلی اور آخری محبت ہیں۔ زیبا نے ان کی زندگی اور گھر کو جنت بنایا ہوا ہے۔

محمد علی کی وفات کے بعد اداکارہ زیبا نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ "محمد علی کے بغیر جینا بہت مشکل لگتا ہے وہ ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ میں کسی بھی لمحے انہیں نہیں بھول پاتی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے باقی دن ان کے بغیر اکیلے ہی کاٹنے ہیں۔"

سماجی و سیاسی زندگی

محمد علی نے کبھی بھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ ان کے ذوالفقار بھٹو کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ 1974ء میں مسلم سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے سلطان قابوس اور شاہ فیصل شہید نے علی زیب ہاؤس میں ہی قیام کیا تھا، اسی دوران فلسطین آزادی کے رہنما یاسر عرفات مرحوم نے بھی محمد علی سے ملنے کی خواہش کی تھی، اور مسقط عمان کے سلطان قابوس نے انھیں غیر سرکاری سفیر کی حیثیت سے تعریفی شیلڈ پیش کی، ایران کے شہنشاہ نے "پہلوی ایوارڈ" دیا۔ اس طرح عالمی سطح پر محمد علی کو مقبولیت حاصل رہی۔ پاکستان میں ہر سربراہ حکومت سے ان کے اچھے اور قریبی تعلقات قائم رہے۔ بھٹو کی حمایت کرنے پر 1977ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں انھیں جیل بھی کاٹنی پڑی۔ تاہم حالات ٹھک ہونے کے بعد جنرل ضیاء الحق سے محمد علی کے اچھے اور قریبی تعلقات ہو گئے۔ وہ ضیاء الحق کے ساتھ 1983ء میں بھارت کے دورہ پر بھی گئے۔

اس دورے کے دوران اندرا گاندھی نے ضیاء الحق سے خواہش ظاہر کی کہ محمد علی ہماری فلموں میں کام کریں، تاکہ فلموں کے ذریعے ہمارے تعلقات بہتر ہو سکیں، لہٰذا پاکستان آنے کے بعد ضیاء الحق نے خصوصی طور پر محمد علی کو ملاقات کے لیے بلایا، اور بھارتی فلموں میں کام کرنے کے لیے راضی کیا، یوں انھوں نے اپنی بیوی زیبا کے ساتھ منوج کمار کی فلم "کلرک" میں کام کیا لیکن جب منوج کمار نے فلم دیکھی تو محمد علی کی اداکاری کے سامنے خود کو بونا محسوس کیا اس لیے اپنے تعصب کی بناء پر محمد علی کا سارا اہم کام کاٹ کر ان کا کردار ثانوی کر دیا، جس کے باعث فلم بھی ناکام ہو گئی۔

نواز شریف سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے، وہ ان کے ایڈوائز بھی رہے، محمد علی کو اسی طرح ہمیشہ قومی سطح پر اولیت دی جاتی رہی۔

انھوں نے "علی زیب فاؤنڈیشن" کے تحت سرگودھا، فیصل آباد، ساہیوال اور میانوالی میں تھیلیسیمیا میں مبتلا بچوں کے علاج اور کفالت کے لیے ہسپتال قائم کیے، جہاں بلا معاوضہ بچوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس ادارے کے تمام اخراجات وہ اپنے وسائل سے پورے کرتے تھے۔ "علی زیب فاؤنڈیشن" کے علاوہ محمد علی کئی

اداروں کے صدر اور فاؤنڈر ممبر رہے۔ ان تمام امور میں ان کی پیاری بیوی بھی ان کے ہم رکاب رہیں۔ نجی سطح پر بھی علی زیب ضرورت مندوں کی ہر ممکن مدد معاونت کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے کئی بیواؤں اور یتیموں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ بہت سے غریبوں کے گھر کے چولہے محمد علی کے امدادی چیک سے جلتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے ساتھیوں کے بُرے وقت میں کام آتے تھے۔

بلاشبہ ان جیسے فن کار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور کسی بھی فلمی صنعت کو نصیب سے میسر آتے ہیں۔ محمد علی نے، جو کردار پر فارم کیے وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اس بلند پایہ فن کار پر فن بھی ناز کرتا ہے۔ وہ ورسٹائل کار فن تھے، آج وہ ہم میں نہیں، لیکن ان کی یادیں اور ان کا فن انھیں ہمیشہ ہمارے دِلوں میں زندہ رکھے گا۔

پاکستان کے اس مایہ ناز اور عہد ساز اداکار نے اپنی 69 سالہ زندگی انتہائی قابل رشک اور قابل تقلید گزاری۔ قدرت نے مرحوم کو افسانوی شہرت عطا کی تھی۔ ان کی پُر اثر شخصیت میں ایسی مقناطیسیت تھی کہ جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا، ان ہی کا ہو جاتا۔

محمد علی نے 277 فلموں میں کام کیا جن میں 248 اردو، 17 پنجابی، 8 پشتو، 2 ڈبل ورژن انڈین، 1 بنگالی۔ 28 فلموں میں بطور مہمان اداکار اور ایک ڈاکومنٹری فلم میں کام کیا۔

محمد علی گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے ان کا ہفتے میں دو بار ڈائلیسیس ہوتا تھا۔

اتوار 19 مارچ 2006ء میں ان کا لاہور میں انتقال ہوا میاں میر قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی بیوی زیبا بیگم نے محمد علی کی قبر کے پاؤں میں اپنی قبر کی زمین الاٹ کرالی ہے۔ یہ ہے ان کی محبت کی عظیم مثال۔

محمد علی کی موت کے بعد واقعی فن اداکاری کا ایک باب بند ہو گیا ہے۔ کیونکہ مرحوم اس مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے جس میں جسمانی حرکات و سکنات کے ساتھ ساتھ آواز کی ادائیگی، تلفظ کی صحت اور زبان کی نزاکتوں کو بھی برابر کی اہمیت دی جاتی تھی۔

کیبل نیوز ورلڈ نیٹ ورک نے ایشیا کے آل ٹائم بہترین اداکاروں کی لسٹ جاری کی ہے جس میں محمد علی اور زیبا کو 25 اداکاروں میں شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ انڈیا سے امیتابھ۔ گرودت، مینا کماری اور نرگس شامل ہیں حیرت کی بات یہ ہے کہ دلیپ کمار کو سرے سے فراموش کر دیا گیا ہے۔

محمد علی کی فلموں کی تفصیل

1962ء۔ چراغ جلتا رہا، دال میں کالا، تجھے نے مان لیا، باجی

1963ء شرارت، قتل کے بعد، مسٹر ایکس، خود دار، سفید خون، خاندان، بیس دن۔

1964ء ہیڈ کانسٹیبل، رواج، خاموش رہو، عورت کا پیار، شیر دی بچی، چھوٹی بہن، ایسا بھی ہوتا ہے، دل کے ٹکڑے، تماشا، شبنم

1965ء ہزار داستان، ناچے ناگن باجے بین، کنیز، صنم، مسٹر ایکس ان کراچی، کھوٹا پیسا، مسٹر اللہ دتہ، تصویر، معجزہ، ہمراہی، بھائی جان، جاگ اٹھا انسان

1966ء اکیلے نا جانا، باغی سردار، عادل، گھر کا اجالا، نغمہ صحرا، مادر وطن، لوری، جانباز، آئینہ، بہادر، جان پہچان، وطن کی پکار، سجدہ

1967ء حاتم طائی، امام دین، ہمراز، آگ، ووہٹی، لالا رخ، محل، پاکیزہ، یار دوست، مجھے جینے دو، دل دیا درد لیا

1968ء سونے کی چڑیا، صاعقہ، پرستان، میرا گھر میری جنت، بالم، تاج محل، شاہی محل، تم ملے پیار ملا، نیلا پربت، پیاملن کی آس، آسرا، جیسے جانتے نہیں، زندگی کتنی حسین ہے

1969ء بہورانی، دل بیتاب، گیت کہیں سنگیت کہیں، پہاریں پھر بھی آئیں گی، ناز، آنچ، انجان، آنسو بن گے موتی، بازی، انسان اور آدمی

1970ء نورین، بے قصور، محبت رنگ لائے گی، نجمہ، ایک پھول ایک پتھر، دنیا نہ مانے، یادیں، تیری صورت میری آنکھیں، انصاف اور قانون، وحشی

1971ء سلام محبت، کرشمہ، آنسو بہایا پتھروں نے، خاک اور خون، دل اور دنیا، افسانہ زندگی کا، میرے ہمسفر، الزام

1972ء دل اک آئینہ، بدلے کی دنیا ساتھی، محبت، سبق، گھرانہ، نیا راستہ، سرحد کی گود میں، آس

1973ء زخمی، دامن اور چنگاری، خوشیا، ندیا کے پار، سماج، بانو رانی، ٹائیگر گینگ، پرچھائیاں، آبرو، تم سلامت رہو، آئینہ اور صورت

1974ء پھول میرے گلشن کا، نخافرشتہ، حقیقت، قسمت، دشمن، شمع، دیدار، بے مثال، بن بادل برسات، پیاسا، آرزو، ملاپ، شیریں فرہاد، تیرے میرے سپنے، محبت زندہ ہے، معاشرہ، شکوہ، گمراہ

1975ء اسرار، اک گناہ اور سہی، پروفیسر، پلکیں، اجنبی، صورت اور سیرت، بکھرے موتی، جب جب پھول کھلے، بدل گیا انسان، نیک پروین، اللہ اکبر، نوکر، راجہ جانی، راستے کا پتھر، آگ اور آنسو، عورت اک پہیلی، داغ، دامن کی آگ

1976ء خریدار، ان داتا، نشیمن، دھڑکن، گونج اٹھی شہنائی، آپ کا خادم، پھول اور شعلے، بھروسہ، پہلی نظر، جینے کی راہ، نیا سورج

1977ء روٹی کپڑا اور انسان، ٹیپو سلطان، کالو، اپنے ہوئے پرائے، آگ اور زندگی، سلاخیں، امبر، ملن، دل کے داغ، آدمی کورا کاغذ، بارات، انتخاب

1978ء ٹکراؤ، انقلاب، دو ڈاکو، حیدر علی، سیتا مریم مارگریٹ، اچھے میاں، خدا اور محبت، آواز، بہن بھائی، وعدے کی زنجیر، نقش قدم، چوری چوری، راجہ کی آئے گی بارات

1979ء عبادت، جوش، جرنل بخت خان، آپ سے کیا پردہ، دہشت، آگ، ضمیر

1989ء بدنام، منزل، بڑا آدمی، سنگرام، گن مین، شیر اں دے پتر شیر

1981ء وطن، فاصلے، کرن اور کلی، گھیراؤ، کھوٹے سکے، تانگے والی، کنارہ، نصیب، مہربانی

اداروں کے صدر اور فاؤنڈر ممبر رہے۔ ان تمام امور میں ان کی پیاری بیوی بھی ان کے ہم رکاب رہیں۔ نجی سطح پر بھی علی زیب ضرورت مندوں کی ہر ممکن مدد معاونت کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے کئی بیواؤں اور یتیموں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ بہت سے غریبوں کے گھر کے چولہے محمد علی کے امدادی چیک سے جلتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے ساتھیوں کے بُرے وقت میں کام آتے تھے۔

بلاشبہ ان جیسے فن کار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور کسی بھی فلمی صنعت کو نصیب سے میسر آتے ہیں۔ محمد علی نے، جو کردار پر فارم کیے وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اس بلند پایہ فن کار پر فن بھی ناز کرتا ہے۔ وہ ورسٹائل کار فن تھے، آج وہ ہم میں نہیں، لیکن ان کی یادیں اور ان کا فن انھیں ہمیشہ ہمارے دِلوں میں زندہ رکھے گا۔

پاکستان کے اس مایہ ناز اور عہد ساز اداکار نے اپنی 69 سالہ زندگی انتہائی قابل رشک اور قابل تقلید گزاری۔ قدرت نے مرحوم کو افسانوی شہرت عطا کی تھی۔ ان کی پُر اثر شخصیت میں ایسی مقناطیسیت تھی کہ جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا، ان ہی کا ہو جاتا۔

محمد علی نے 277 فلموں میں کام کیا جن میں 248 اردو، 17 پنجابی، 8 پشتو، 2 ڈبل ورژن انڈین، 1 بنگالی۔ 28 فلموں میں بطور مہمان اداکار اور ایک ڈاکومنٹری فلم میں کام کیا۔

محمد علی گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے ان کا ہفتے میں دو بار ڈائلیسیس ہوتا تھا۔

اتوار 19 مارچ 2006ء میں ان کا لاہور میں انتقال ہوا میاں میر قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی بیوی زیبا بیگم نے محمد علی کی قبر کے پاؤں میں اپنی قبر کی زمین الاٹ کرالی ہے۔ یہ ہے ان کی محبت کی عظیم مثال۔

محمد علی کی موت کے بعد واقعی فن اداکاری کا ایک باب بند ہو گیا ہے۔ کیونکہ مرحوم اس مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے جس میں جسمانی حرکات و سکنات کے ساتھ ساتھ آواز کی ادائیگی، تلفظ کی صحت اور زبان کی نزاکتوں کو بھی برابر کی اہمیت دی جاتی تھی۔

کیبل نیوز ورلڈ نیٹ ورک نے ایشیا کے آل ٹائم بہترین اداکاروں کی لسٹ جاری کی ہے جس میں محمد علی اور زیبا کو 25 اداکاروں میں شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ انڈیا سے امیتابھ۔ گرودت، مینا کماری اور نرگس شامل ہیں حیرت کی بات یہ ہے کہ دلیپ کمار کو سرے سے فراموش کر دیا گیا ہے۔

محمد علی کی فلموں کی تفصیل

1962ء۔ چراغ جلتا رہا، دال میں کالا، تجھے نے مان لیا، باجی

1963ء شرارت، قتل کے بعد، مسٹر ایکس، خود دار، سفید خون، خاندان، بیس دن۔

1964ء ہیڈ کانسٹیبل، رواج، خاموش رہو، عورت کا پیار، شیر دی بچی، چھوٹی بہن، ایسا بھی ہوتا ہے، دل کے ٹکڑے، تماشا، شبنم

1965ء ہزار داستان، ناچے ناگن باجے بین، کنیز، صنم، مسٹر ایکس ان کراچی، کھوٹا پیسا، مسٹر اللہ دتہ، تصویر، معجزہ، ہمراہی، بھائی جان، جاگ اٹھا انسان

1966ء اکیلے نا جانا، باغی سردار، عادل، گھر کا اجالا، نغمہ صحرا، مادر وطن، لوری، جانباز، آئینہ، بہادر، جان پہچان، وطن کی پکار، سجدہ

1967ء حاتم طائی، امام دین، ہمراز، آگ، ووہٹی، لالا رخ، محل، پاکیزہ، یار

1982ء تیرے بناء کیا جینا، سہارے، ذرا سی بات، بگڑی نسلیں، اک دوجے کے لیے، آج کی رات، مانگ میری بھر دو، بارڈر بو ٹلٹ

1983ء کائنات، بھیگے بدن، بدلتے رشتے، ٹینا، وڈا خان، مقدر کا سکندر، دوریاں، نام میرا بدنام، ہیبت خان، بارود

1984ء آندھی اور طوفان، بوبی، نصیبوں والی، آگ کا سمندر، دل ماں دا، مہک، اک دلہن، جینے نہیں دوں گی، خون اور پانی

1985ء شاہ بہرام، غلامی، ڈرائیکٹ حوالدار، زما پیغام، زنجیر، بات بن جائے، ہم ایک ہیں، شک

1986ء قاتل کی تلاش، وائٹ گولڈ، ایک ہی راستہ، قرض، آگ اور شعلے، میاں بیوی اور وہ، قسم منے کی، دیوار

1987ء مستی خان، تیری بانہوں میں، روکی بابا، ڈوئے ڈاکو (پشتو)، چن پنجاب دا

1988ء دپلار ارمان (پشتو)، محبت ہو تو ایسی، کرائے کے قاتل

1989ء شانی، جنون، جانے انجانے (بنگالی)، کلرک (انڈین)

1990ء کو فرو اسلام (پشتو)، دامور انتقام (پشتو)، ٹرک ڈرائیور (پشتو)

1991ء دشمن کا کا اور یو ہناوے، دونوں پشتو فلمیں ہیں

1992ء حسینوں کی بارات (مہمان اداکار)

1995ء دم مست قلندر (مہمان اداکار)

☆ - - - ☆ - - - ☆

اقتباسات

جو حق دار ہیں، ان کو بھی دو اور جو ناحق کا مانگنے والا ہے اس کو بھی دو تاکہ تجھے جو ناحق کا مل رہا ہے، کہیں دینا بند نہ ہو جائے۔

اشفاق احمد

ایک بات زندگی بھر یاد رکھنا اور وہ یہ کہ کسی کو دھوکا دینا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ دھوکے میں بڑی جان ہوتی ہے وہ مرتا نہیں ہے۔ گھوم پھر کر ایک روز واپس آپ کے پاس ہی پہنچ جاتا ہے کیونکہ اس کو اپنے کھانے سے بڑی محبت ہے اور وہ اپنی جائے پیدائش کو چھوڑ کر کہیں رہ نہیں سکتا۔

اشفاق احمد

مراسلہ : سمارا

مجھے ہے حکمِ اذاں

مون

خیام سرحدی، عمران عباس، حسن نقوی، زاہد قُریشی، سُہیل سمیر، جگن کاظم، مہرین راحیل، حناد لپذیر، فائزہ گیلانی نے مل کر "مجھے ہے حکم اذاں" کہانی میں رنگ بھر کر ایک اچھے ڈرامے کی شکل دی ہے۔

کہانی مولوی صاحب اور ان کی فیملی کے ارد گرد گھومتی ہے۔ مولوی صاحب چھ جماعت پاس نا صرف ایک خُود مذہبی انسان ہیں بلکہ شدید انا پرست اپنی راست بازی پر نازاں بھی ہیں اور ڈنڈے یا سختی کے زور پر اسلام کا نافذ سب پر کرنا چاہتے ہیں۔

اب سب پر تو زور چل نہیں سکتا اس لیے سارا زور گھر والوں پر ہے۔

بیٹا فہد ملٹی پرسنالٹی کا شکار ہے ایف ایم کا پریزنٹر بھی ہے اور میوزک کا عاشق بھی۔ اور یہ سب کام اپنے والد سے چُھپ کر کرتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی اچھا کام بھی کرے تو بھی والد صاحب کے معیار کو نہیں چھو سکتا ہے۔

بڑی بیاہی بیٹی سلمٰی کو والد صاحب نے زبردستی سسرال سے لا کر گھر بٹھا رکھا ہے کیونکہ والد صاحب نے بیٹی کی نند کا رشتہ طے کروایا تھا اور وہ شادی والے دن گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ پھر غلطی کا احساس ہونے پر اس کے بھائی نے معاف کر دیا اور گھر رکھ لیا۔۔۔ جس پر مولوی صاحب کو شدید بے عزتی کا احساس ہوتا ہے اور "گناہ" کا بھی۔ اس لیے ایسے بے دین لوگوں میں بیٹی کو نہیں رہنے دیتے اور شرط رکھتے ہیں کہ جب تک داماد اپنی بہن کو گھر سے نہیں نکال دیتا تب تک بیٹی کو نہیں بھیجیں گے۔

اس بات کو نبھانے کے لیے داماد کی بے عزتی کر کے گھر سے نکالنے سمیت نواسے کو بھی گھر سے نکال دیا۔۔۔ بیٹی دوبارہ ماں بننے کے اعزاز سے محروم ہو گئی۔۔۔ مگر اپنی ضد نہیں چھوڑی انہوں نے۔

کیونکہ بقول ان کے داماد نے بہن کو معاف کر کے گھر میں واپس آنے دے کر بے حیائی اور بُرائی کی ترویج کی ہے اور یہ اسلام میں جائز نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

تیسری اولاد سب سے چھوٹی بیٹی "نفیسہ" ہے۔۔ جو لاڈلی بھی ہے اور دلیر بھی۔ ہمسائے کے لڑکے کو پسند کرتی ہے اور رشتے پر بے عزتی سمیت انکار کے بعد چُھپ کر نکاح بھی کر لیتی ہے۔ جب وہ اپنی والدہ کو بتاتی ہے تو اس کے والد نے اتفاقا" سُن لیا۔ جس پر مولوی صاحب اپنی عزت بچانے کی خاطر نفیسہ کی بخار کی دوا میں زہر مکس کر کے دے دیتے ہیں اور وہ مر جاتی ہے۔

اس فیملی کا آخری کردار مولوی صاحب کی یتیم بھتیجی ہے جس کی شادی فہد سے ہوتی ہے۔ اس کا نام آخر تک سمجھ نہیں آیا کہ رکشا ہے یا رشا۔۔۔۔

خیام سرحدی کا کردار حاجی صاحب اس ڈرامے میں بہت ہی عمدہ اور قابل تعریف ہے "ایکٹنگ سمیت" اسلام کی اصل رُوح کو سمجھتے ہیں اور اسے بجائے دوسروں پر تھوپنے کے بس تلقین کرتے ہیں اور مثال بن کر اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔

زین کے گھر میں کرائے دار خاتون "نشاط" رہتی ہیں جس کی ایک کم عقل سی فیشن کی دلدادہ ڈراموں فلموں سے متاثر لڑکی ہے۔۔۔ ان دونوں ماں بیٹی کا کردار آخر تک سمجھ نہیں آیا کہ ان کے ہونے کی کیا وجہ تھی ڈرامے میں۔

دیکھنے والوں کو اپنی طبیعت کے حساب سے اختلاف یا متفق ہونے کو دونوں طرح کے خیالات ملیں گے اس ڈرامہ میں۔

ایک طرف مولوی صاحب نے جہاں اسلام کو انتہا پر جا کر اپنایا کہ جو حق اور منصب اللہ کا ہے اس کو خُود سنبھالنے کی کوشش کی۔ اپنی راست بازی کے غرور میں مبتلا ہو گئے اور اللہ کی بجائے اپنی انا کو پوجنے لگ گئے۔

دوسری طرف حاجی صاحب نے اسلام کی رُوح کو سمجھ کر اس کو اپنایا اور یہ سبق دیا کہ صرف نماز، قرآن روزہ ہی عبادت نہیں ہے بلکہ اسلام کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات پر عمل کرنا بھی عبادت کا حصہ ہے۔

کہانی کا انجام بھی بہت نیچرل اور اچھا ہے۔ اس کہانی میں مولوی صاحب کی بیگم کی اداکاری بھی بہت ہی بہترین ہے۔۔۔ کئی سین میں دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چمک سکتے ہیں اس لیے ٹشو پیپر کا خرچہ آپ کے ذمہ اور ڈرامہ کے اچھا ہونے کی گارنٹی میرے ذمہ۔

☆---☆---☆

الکھ نگری از ممتاز مفتی (انتخاب: مونا سید)۔

"حرص ہی حرص ہے، طمع ہی طمع، اتنے حریص ہو گئے ہیں کہ اپنی غرض کے لیے اللہ کا نام بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو بیچنے لگے ہیں۔ اسلام کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ اللہ سے مخول کر رہے ہیں۔۔

جھوٹے، فریبی۔۔۔۔۔۔۔۔۔جب بڑوں کا یہ حال ہے۔ تو چھوٹوں کا کیا ہو گا اور تو کہتا پھرتا ہے کہ اس ملک پر اللہ کی رحمت ہے، جہاں اللہ کا نام ٹکے ٹکے پر بک رہا ہے۔ اتنی ناقدری۔ توبہ ہے! توبہ ہے! اللہ کی ناقدری، دین کی ناقدری، وہاں رحمت ہو گی کیا؟ بول۔۔۔" وہ پھر غصے سے چلانے لگا، "تجھے یہاں اس لیے نہیں بلایا کہ "منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھا رہے۔۔

یہ کیسا انصاف

ایک کلاسک فلم ۔۔۔ ہمارا دل آپ کے پاس ہے۔۔۔ میں ہیروئن ایشوریہ رائے جو کہ پوری فلم میں ساڑھی میں ملبوس ہے۔ گانوں کے دوران سوئٹر رلینڈ کی خون جما دینے والی سردی میں بھی اپنے پیٹ اور بازوں کو ننگا کیے ہوئے ہے اور انیل کپور کے ساتھ ناچ رہی ہے، جس نے سوئٹر پہن رکھا ہے۔

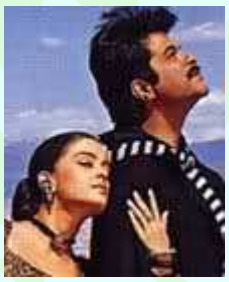

بالکل ایسا ہی ایک منظر فلم ۔۔۔ پکار۔۔۔ میں بھی نظر آیا جس میں انیل کپور اور نمرتا پر ایسا ہی رومانی گانا مذکورہ ملک کی سرد فضا میں عکس بند کیا گیا۔ تو وہاں بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے میں آیا کہ ہیرو تو فل گرم کپڑوں میں ملبوس تھا اور ہیروئن بچاری۔۔۔۔۔

واہ بھیا، یہ کیسا انصاف ہے۔ کہ ہیرو کو سب کچھ پہناؤ اور ہیروئن بچاری ٹھٹھرتی رہے۔

☆ - - -☆ - - -☆

مزاج عاشقانہ

بالی وڈ کے معروف ہیرو عامر خان کا مزاج بچپن سے عاشقانہ ہے۔ اس نے چھوٹی سی عمر میں سات لڑکیوں سے عشق کیا مگر سب نے اسے ٹھکرا دیا۔ احتجاجا خان نے ہر مرتبہ اپنا سر منڈوایا۔ اس طرح سات مرتبہ سر منڈوا کر اس نے ایک خاص ریکارڈ قائم کیا۔ ایک ٹی وی کو چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا کہ اب وہ میچور ہے اس کے سر سے عشق کا بھوت اتر چکا ہے اور اب وہ لڑکیوں کے پیچھے نہیں بلکہ لڑکیاں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں۔

عامر جی اب تو اچھی طرح سمجھ آگیا ہوگا،

تحریر کائنات

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

☆ - - -☆ - - -☆

شہرت نے بچالیا

ہندی فلم انڈسٹری کے مشہور اداکار ریتھک روشن اور ایشا پٹیل کو

اس وقت شدید مشکل کا سامنا کرنا پڑا جب وہ ایک اسٹیج شو کرنے کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ کہ ایک شاہراہ پر انھیں مسلح ڈاکوں نے گھیر لیا اور جیب سے رقم نکالنے کے بعد ان کے ہاتھوں سے گھڑیاں بھی اتار لیں اور گاڑی چھیننے کی بھی کوشش کی، مگر اسی دوران ایک ڈاکو نے انھیں پہچان لیا تو ڈاکوں نے معذرت کرتے ہوئے ان کی اشیاء اور رقم واپس کردی اور چلے گئے۔

چلو اسٹار ہونے کا کچھ تو فائدہ ہوا۔ عجب ہوا ڑے،

☆ - - -☆ - - -☆

ہیرو کو زیرو

اداکار گووندا نے ایک شادی میں شرکت کی۔ اس شادی کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں گووندا نے شرکت کی اور وہ اپنی پوری زندہ دلی کے ساتھ شریک ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ گووندا دلہا دلہن کو مبارکباد دے گا اور نکل لے گا مگر کلر فل گووندا نہ صرف موجود رہا بلکہ باراتیوں میں بھی گھل مل گیا اور دلہا دلہن کو مبارک باد دینے کے بعد اس نے اچانک بریک ڈانس شروع کردیا۔ اور لوگوں کو حیران کر دیا۔ گووندا کی موجودگی میں دلہا دو نمبر کی چیز بن کر رہ گیا کیونکہ لوگوں کی پوری توجہ ہیرو نمبرون کی طرف تھی۔ ویسے گووندا نے یہ سب کچھ مفت میں کیا اور ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔

واہ ڑے۔۔۔ گووندا ہر وقت ناچنے کو ہی تیار رہتا ہے۔

☆ - - -☆ - - -☆

گھبر سنگھ

مشہور زمانہ فلم ۔۔۔ شعلے ۔۔۔ پر فلم میکر رمیش سپی نے اپنا سب کچھ داو پر لگا کر یہ فلم بنائی تھی مگر ریلیز ہوتے ہی ۔۔۔ شعلے ۔۔۔۔ فلم کو بڑی فلاپ فلم قرار دے دیا گیا۔ اس موقع پر رمیش نے شعلے کے اہم اداکاروں اور رائٹرز کی میٹنگ طلب کی۔ لیکن اس میں سوائے سلیم جاوید، امیتابچن اور رمیش سپی کے کوئی نہیں آیا۔ یاد رہے کہ امجد خان کو کال ہی نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس وقت تک فلم کی ناکامی کا ذمہ دار ناتجربہ کار ولن امجد خان کو سمجھا جا رہا تھا۔ میٹنگ کے دوران امیتابچن نے تجویز پیش کی کہ فلم کو مکمل ناکامی سے بچانے کے لیے تمام سینماوں سے فوری طور پر اتار لیا جائے اور ان حصوں کی شوٹنگ دوبارہ کی جائے، جس میں امجد خان ہے۔ لیکن رائٹر سلیم جاوید نے اس کی سخت مخالفت کی اور یہ دھمکی دی کہ اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو وہ فلم کی کریڈٹ لسٹ پر سے اپنا نام ہٹا لے گا۔ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور رمیش نے فلم کو جوں کا توں چلنے دیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

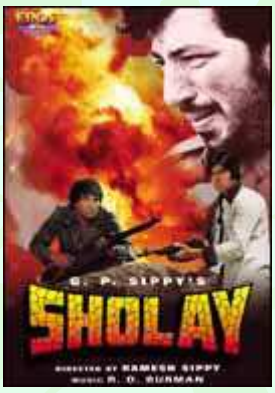

اوئی ماں ۔۔۔۔ اگر اس تجویز پر عمل ہو جاتا تو سب گھبر سنگھ جیسا کردار کیسے پاتے۔

☆ - - -☆ - - -☆

سوال آپ کے

جواب ہمارے

☆---☆---☆

فارس

الف کے بعد ب ہی کیوں آتی ہے۔۔۔؟؟

اب کے اجزائے ترکیبی کے لئے یہ ضروری ہے!!

انڈہ ہمیشہ گول ہی کیوں ہوتا ہے چاہے مرغی کا ہو یا حساب کا؟؟

لگتا ہے کافی شوق رکھتے ہیں!!

یہ حساب کب اپنی پرابلمز خود حل کرنا سیکھے گا؟؟

شادی کروانی ہے کیا؟

پانی گیلا کیوں ہوتا ہے؟؟

بے مروت نہیں ہے جی!!

الو دن کو نکلنے کے لیے سن گلاسز کیوں استعمال نہیں کرتے؟؟

یہ ان کے ذہن میں ہی نہیں آیا، کیونکہ الو جو ہوئے۔

☆---☆---☆

Faaizaa

ٹیم بھائی بیگم کو گھمانے بھی ون اردو پہ ھی کیوں آتے ھیں؟

آپ کو واقعی ایسا لگتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یا پھر بغرض آڈٹ ان کا نزول ہوتا ہے؟!!

کیا ٹیم بھائی نے اس دفعہ گھر والوں کو بھی پوائنٹی عیدی دی؟

جی بالکل اور وہ بھی طلائی پوائنٹس کی شکل میں۔

☆---☆---☆

Sameer

گلی میں آج چاند نکلا۔۔۔پر کیسے؟

نکلا۔۔۔۔۔یا نکلی؟؟

سچ سچ بتائیں آپ سوالوں کے جوابات کس سے لکھواتی ہیں؟

بوجھو تو جانیں

بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی؟

جب تک بکرا خود اپنی خیر نہیں مناتا!!

اگر ون اردو کا نام پاگل خانہ رکھ دیا جائے تو؟

آپ کس طرف جانا پسند کریں گے؟!!

ڈاکٹر اپنا علاج خود کیوں نہیں کرتے؟

کیونکہ اسے معلوم ہے کہ قبرستان میں ناحق ایک قبر کا اضافہ ہی ہوگا!!

اگر آپ کے سامنے شیر آجائے تو کیا ہوگا؟

کچھ نہیں ہوگا۔یعنی کہ کچھ دیر کے بعد شیر کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوگا وہاں۔

☆---☆---☆

بل گیٹس

دوسرا اور آخری حصہ

دلپسند سیال

بل گیٹس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نئے مائکرو کمپیوٹر کا خالق ہے۔ جبکہ یہ سچ نہیں ہے اس لیے کہ بل گیٹس اور اس کے دوست پال ایلن نے پہلے کسی آلٹر کو استعمال نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے لیے کسی کوڈ کو بہتر بنایا تھا۔ انہوں نے صرف دو ماہ کی مدت میں بیسک پروگرام کو بہتر بنایا اور اچھے طریقے سے اس کی وضاحت کی تھی۔ پال ایلن نے نئے بیسک کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا اور جبکہ بل گیٹس نے اسے کاروباری لحاظ سے مارکیٹ میں لانے کی تیاری کی۔ ایلن نے اس سے پہلے کبھی نئے بیسک آلٹر کو متعارف نہیں کرایا تھا لیکن اس بار اس کا مظاہرہ کامیاب رہا اور اس نے micro instrumentation and telemetry systems سے سودے بازی کر کے حقوق اپنے اور گیٹس کے نام کرا لیے۔ یہ وہ وقت تھا جب بل گیٹس نے ہاورڈ یونیورسٹی چھوڑ دی تھی اور اپنے دوست پال ایلن کے ساتھ مائکروسوفٹ کمپنی میں شامل ہو گیا تھا۔

بل گیٹس کو اپنی کمپنی قائم کرانے میں پال ایلن کا ہاتھ ہے۔ وہ ہر وقت بل گیٹس کے کان میں یہی پھونکتا رہتا تھا کہ انہیں اپنی کمپنی قائم کرنی چاہیے۔ اور آخر کار بل گیٹس نے 1976ء میں مائکروسوفٹ کارپوریشن کے نام سے اپنی کمپنی قائم کی۔

مائکروسوفٹ کارپوریشن کمپنی 26 نومبر 1976ء میں سیکریٹری آف اسٹیٹ کی موجودگی میں قائم کی گئی تھی۔ کمپنی کا منشور یا مقصد یہ تھا کہ اب ساری دنیا کے گھروں اور دفتروں میں استعمال ہونے والے کمپیوٹر میں ان کی کمپنی کا بنایا ہوا پروگرام استعمال ہو تاکہ لوگ نئی ٹیکنالوجی سے فیض اٹھا سکیں۔ نیٹ کے ذریعے ساری دنیا کو جوڑ دیں اور ایک بڑا ہائی وے بنائیں جس کا نام انفارمیشن ہائی وے ہو۔

انفارمیشن ہائی وے کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر آدمی گھر بیٹھے اپنے کمپیوٹر سے کسی بھی معاملے میں اپنا ووٹ دے سکے۔ اس بارے میں بل گیٹس نے مثال دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر صدر امریکا قوم کے سامنے کوئی مسئلہ رکھ کر ان کی رائے پوچھنا چاہے تو ہم ایسا سوفٹ ویئر بنا دیں گے کہ عام لوگ اپنے کمپیوٹر سے صرف ایک بٹن دبا کر انہیں اسی وقت اپنی رائے سے آگاہ کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں ہاں یا نہ دو رائے بھی ہو سکتی ہیں۔ ہم اس کا فیصد نکال کر انہیں دو منٹ کے بعد بتا دیں گے کہ قوم اس معاملے میں آپ کے ساتھ ہے یا نہیں۔

یکم جنوری 1979ء میں کمپنی کا آفس سیٹل منتقل کر دیا گیا۔ شروع میں بل گیٹس نے سولہ لڑکے ملازم رکھے تھے جو کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ ایک برس بعد ہی کمپنی میں کام کرنے والوں کی تعداد اٹھائیس ہو گئی ان کا کاروبار ترقی کی راہ پر گامزن تھا مگر اس کے باجود بھی بل گیٹس کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نہ نکل جائے اور وہ کسی گہری گھڈ میں جا گرے۔ بل گیٹس کا کہنا ہے یہ وہ وقت تھا جب ہم نے سوفٹ ویئر بنائے حالانکہ اس وقت دوسری کمپنیاں صرف ہارڈ ویئر بنا رہی تھیں۔ لیکن میرا اور ایلن کا خیال تھا کہ آنے والے وقت میں سافٹ ویئر ساری ٹیکنالوجی پر چھا جائے گا۔ شکر ہے ہمارا خیال درست نکلا۔

1974ء میں آلٹر 8080 کی کٹ مارکیٹ میں آئی جو دنیا کی پہلی مائکرو کمپیوٹر کٹ تھی اور یہ کمرشل ماڈلز کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی اس کے بعد ہوم کمپیوٹر لانچ کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں تو بل گیٹس اور پال ایلن نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور اس پہلے ہوم کمپیوٹر کے لیے ایک سوفٹ ویئر بنا کر کمپنی کو دیا جو کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

اس سے پہلے کمپیوٹر صرف صنعتی طور پر استعمال ہوتا تھا اور اس کی جسامت بھی بہت بڑی ہوتی تھی۔ اس میں بہت سے ہارڈ ڈسک، ریم اور مدر بورڈ استعمال ہوتے تھے لیکن جب اسے گھریلو پیمانے پر متعارف کرایا گیا تو اس کا سائز بہت چھوٹا رکھا گیا۔ تاہم وہ DOS آپریٹنگ سسٹم پر چلتا تھا۔ اس میں ہارڈ ڈسک کے بجائے دو فلاپی ڈرائیور استعمال ہوتی تھی جن سے ایک کمپیوٹر چلتا تھا اگر اس کام کی کاپی کرنا ہوتی تو پھر دوسرا ڈرائیور کو کام میں لایا جاتا تھا۔ یعنی کہ اس کمپیوٹر میں ایک وقت میں صرف ایک کام کیا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی ٹائپنگ کرنا چاہے تو صرف ٹائپنگ ہی کر سکتا تھا اگر کوئی اور کام کرنا ہوتا تو اس کے لیے پروگرام تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ یہ کمپیوٹر پروگرامنگ کے لحاظ سے بہت محدود تھا اس پر بیک وقت بہت سے کام نہیں کیے جا سکتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر میں تبدیلیاں ہوتی رہیں نئی جدت پیدا کی جاتی رہی۔ کچھ عرصے بعد ایسے کمپیوٹر روشناس کرائے گئے جن میں ہارڈ ڈسک استعمال ہوتی تھی ماہرین نے اسے بہت بہتر انداز میں بنایا تھا۔ کمپیوٹر کے اس برانڈ کو مائکروسوفٹ کا نام دیا گیا۔

اس مائکروفٹ کمپیوٹر کے لیے بل گیٹس نے ایک نیا پروگرام "ونڈوز" متعارف کرایا اس پروگرام کے تحت کمپیوٹر پر بیک وقت بہت سے کام کیے جا سکتے تھے۔ یعنی اب آدمی کمپیوٹر پر فلم دیکھ سکتا تھا، گیم کھیل سکتا تھا، حساب کتاب کر سکتا تھا اور کارل ڈرا استعمال کر سکتا تھا۔ بل گیٹس کی اس کوشش سے ایک انقلاب آ گیا۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے "ونڈوز" کی طرف زیادہ توجہ نہ دی لیکن دو سال بعد دھڑا دھڑ لوگ ونڈوز کی طرف متوجہ ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ اس پروگرام "ونڈوز" کی فروخت نے بل گیٹس کو دنیا کا امیر ترین شخص بنا دیا۔

بل گیٹس نے صنعتی پیمانے پر کام کرنے والوں کے لیے بھی بہت سے سوفٹ ویئر بنائے جن میں قابل ذکر پروگرام مائکروسوفٹ آفس ہے۔مائکروسوفٹ آفس کی وجہ سے لوگ DOS کے محتاج نہ رہے۔اس پروگرام کی مدد سے گراف، چارٹ، دستاویزات اور اکاؤنٹس وغیرہ کام بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

بل گیٹس نے سب سے پہلے ونڈوز۔3.0 متعارف کرائی۔اس کے بعد ونڈوز 3.1 اس کے کچھ عرصے بعد ونڈوز 95 متعارف کرائی جو بہت عرصہ تک چلی کیونکہ یہ بہت سے پروگراموں کو چلاتی تھی پھر ونڈوز 97 آئی جو کہ زیادہ عرصہ نہ چلی اس کے بعد ونڈوز 98 آئی جو کہ لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے بارہ سال گزرنے کے باوجود اب بھی بہت سے لوگ اس کا استعمال کررہے ہیں۔ونڈوز 98 کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ یہ ہر قسم کے گیمز اور زیادہ سوفٹ ویئر کو چلا سکتی ہے۔لیکن اس میں سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ ونڈوز انسٹال کرنے کے بعد ڈسپلے ڈرائیور اور ساؤنڈ ڈرائیور بھی انسٹال کرنا پڑتا ہے لیکن جب ونڈوز ایکس پی آئی تو اس نے ونڈوز 98 کی مقبولیت بالکل ختم کردی۔ونڈوز ایکس پی کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے لیے علیحدہ سے ڈرائیور انسٹال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بل گیٹس کو اپنا کاروبار بڑھانے میں شروع شروع میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔بل گیٹس نے ایسی کمپنیوں کو سوفٹ ویئر بھی فروخت کیے جو بعد میں دیوالیا ہوگئیں جس کی وجہ سے انہیں اصل لاگت بھی واپس نہ مل سکی۔مائکروسوفٹ کے لیے دوسرے ملکوں میں ایجنٹ تلاش کرنا بہت مشکل مرحلہ تھا کیونکہ ان ایجنٹوں کو کاروبار کی فروغ کی بجائے اپنے کمیشن کی فکر لگی رہتی تھی اس مسئلہ کا حل بل گیٹس نے یہ ڈھونڈا کہ دوسرے ملکوں میں اپنے دوستوں کو بھیجا۔ان لوگوں نے دوسرے ملکوں میں مائکروسوفٹ کے لیے مارکیٹس تک رسائی حاصل کی جس سے کافی بہتر نتیجہ نکلا۔بل گیٹس نے شروع سے ہی کاروبار کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔پال ایلن اور وہ خود ٹیکنالوجی کی طرف دھیان دیتے جبکہ اپنے تیسرے دوست اسٹیو کو بزنس کی طرف لگادیا اس وجہ سے کسی کی بھی توجہ دو طرفہ نہیں ہونے پائی۔سب اپنی اپنی جگہ یکسوئی سے کام کرتے تھے۔

اس وقت مائکروسوفٹ کارپوریشن کمپنی کے دفاتر 105 ملکوں میں قائم ہیں جن میں 80 ہزار سے زائد لوگ کام کررہے ہیں۔مائکروسوفٹ پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔کمپیوٹر بزنس پر صرف بل گیٹس کا ہی قبضہ ہے۔

بل گیٹس کو اس کے سافٹ ویئر چوری ہونے کی متواتر اطلاع ملنے لگیں تو اس نے ایک کھلا خط شائع کرایا۔جس میں اس نے تاکید کی تھی کہ بہت سے لوگ اس کے سافٹ ویئر چوری کررہے ہیں جس کی وجہ سے سافٹ ویئر کو فروغ دینے میں دشواری کا سامنا ہے۔اب کوئی شخص سافٹ ویئر کو مفت چلانے کی کوشش نہ کرے یہ قانونی جرم ہے۔اس خط کا کافی لوگوں نے بہت برا منایا کیونکہ وہ وہی کچھ کررہے تھے جس کی بل گیٹس نے نشاندہی کی تھی۔سب سے زیادہ شکایت انہیں جاپان، چین، تائیوان اور ہندوستان سے ملیں۔بل گیٹس نے تائیوان سے آنے والے سافٹ ویئر کی خرید وفروخت کو چیلنج کردیا۔اس نے سب سے بڑی کمپنی یادو گروپ پر مقدمہ دائر کردیا کہ اس کی وجہ سے مائکروسافٹ کی ساکھ کو بہت بھاری نقصان پہنچا ہے۔یادو گروپ پر دو لاکھ ڈالر ہرجانے کا دعوی دائر کیا اور یہ مقدمہ بیجنگ کی ایک عدالت میں درج ہوا۔

1999ء میں بل گیٹس پر حکومت نے مقدمہ قائم کردیا جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ مائکروسافٹ کمپنی نہایت جارحانہ انداز میں کاروبار کررہی ہے اور کمپیوٹر کے کاروبار پر اجارہ داری قائم کررکھی ہے۔بل گیٹس، مائکروسافٹ کارپوریشن کے چیرمین کی حیثیت سے پیش ہوا۔بل گیٹس کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ اگر کوئی کمپنی کسی صنعت میں اجارہ داری رکھتی ہے تو یہ کوئی قانونا جرم نہیں ہے میرے موکل نے کسی کو کمپیوٹر پروگرام بنانے سے نہیں روکا۔البتہ مائکروسافٹ "ونڈوز" تیار کرتی ہے جو رجسٹرڈ اور پیٹنٹ ہے چنانچہ کوئی اور کمپنی اسے تیار نہیں کرسکتی۔جب بل گیٹس سے اس کی کمپنی کے اثاثوں کی تعداد بارے پوچھا گیا تو بل گیٹس ٹال مٹول کرکے ادھر ادھر کی ہانکنے لگا۔اس کا جواب وکیل نے دیتے ہوئے کہا کمپنی پوری پابندی سے سارے ٹیکس ادا کررہی ہے اگر بل گیٹس دنیا کا امیر ترین شخص ہے تو اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔اس مقدمے میں کمپنی کے دوسرے عہدار بھی پیش ہوئے اور انہوں نے بے حد تیز وتند جوابات دیے جس سے یہ مقدمہ کمپنی جیت گئی۔

******

یکم جنوری 1994ء میں بل گیٹس نے ڈیلاس، ٹیکساس کی ملینڈا فرنچ سے شادی کی۔ملینڈا فرنچ سے اس کی ملاقات "مین ہٹن" میں ایک مائکروسافٹ پریس کانفرنس کے دوران ہوئی تھی۔ملینڈا فرنچ ڈیوک یونیورسٹی کی گریجویٹ اور کمپیوٹر سائنس اور بزنس کی ڈگڑی لے رکھی تھی۔اس وقت وہ ایک کمپنی میں کام کررہی تھی۔شادی کے بعد ملینڈا نے نوکری چھوڑ دی اور بل گیٹس کی فاؤنڈیشن کا کام سنبھال لیا۔ملینڈا سے بل گیٹس کی تین اولادیں ہیں۔1996ء میں جینیفر کیتھرائین گیٹس۔1999ء میں رائے جون گیٹس اور 2002ء میں فوب ایڈل گیٹس پیدا ہوا۔

کچھ عرصہ بعد بل گیٹس کے باپ نے اپنی فاؤنڈیشن کو بل گیٹس اینڈ ملینڈا فاؤنڈیشن میں ضم کردیا۔اس کا کہنا تھا کہ اس فاؤنڈیشن کا مقصد دنیا سے ناداری، مفلسی اور بیماری کو دور کرنا ہے چاہے وہ کوئی سا ملک ہو یا کوئی سا بھی فرد ہو یہ سب ہم انسانیت کے ناتے کام کررہے ہیں اس لیے کہ دنیا اب سمٹ کر ایک خاندان کی حیثیت اختیار کرچکی ہے

ایک جائزے کے مطابق میں امریکا میں راک فیلر کے بعد بل گیٹس اور ملینڈا دوسرے بڑے بہی خواہ، مشفق اور رحمدل فرد ہیں۔اپنی فاؤنڈیشن کے ذریعے سے وہ اب تک 28 بلین ڈالر تقسیم کرچکے ہیں

بل گیٹس اینڈ ملینڈا فاؤنڈیشن سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان طالب علموں کو وظیفے جاری کرتی ہے جو کہ غریب ہیں۔اس کے علاوہ ایڈز جیسے موذی مرض اور تیسری دنیا کے ملکوں میں نادار مریضوں کے مفت علاج کے لیے ہسپتالوں کو بھاری امداد دیتی ہے۔

جب بل گیٹس کو پتا چلا کہ غربت کی وجہ سے شکاگو کا تعلیمی گراف بہت گر چکا ہے تو اس نے شکاگو کو تعلیم میدان میں آگے لانے کے لیے ایک بڑا منصوبہ تیار کیا اس نے 37 ہائی اسکولوں کا انتخاب کیا جن کو چھ سال تک امداد دی جاتی رہے گی۔

ایک اندازے کے مطابق بل گیٹس اینڈ ملینڈا فاؤنڈیشن اس وقت دنیا کے ایک سو سے زائد ممالک کے ناداراور مفلسوں کی امداد کر رہی ہے اور بیماریوں کے خلاف جہاد کر رہی ہے۔

*****

بل گیٹس 1997ء سے کمپیوٹر ٹیکنالوجی پر کتابیں لکھ رہا ہے۔ وہ اب تک پچاس کتابیں لکھ چکا ہے۔ لوگوں میں ان کی لکھی کتابیں بہت مقبول ہیں وہ انہیں پڑھ کر کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے روشناسی حاصل کرتے ہیں۔ اس کی کتابیں نیوز ویک، یو ایس اے ٹوڈے اور ٹائم میگزین جیسے ادارے شائع کرتے ہیں۔

1999ء میں بل گیٹس نے'' دی اسپیڈ آف تھاٹس '' کے نام سے کتاب لکھی اس کتاب میں بتایا گیا تھا کہ کمپیوٹر آپ کے کاروباری مسائل کیسے حل کر سکتا ہے اس نے پرانے طریقوں کو متروک کر کے نت نئے طریقوں کو روشناس کرایا تھا۔ یہ کتاب پچیس زبانوں میں شائع ہو چکی ہے اور اب دنیا کے ستر سے زیادہ ملکوں میں فروخت ہو رہی ہے یہ کتاب بیسٹ سیلر لسٹ پر چار ماہ تک پہلے نمبر پر رہی جب کہ اس کی کتاب'' دی روڈ آہڈ'' فروخت کے اعتبار سے سات ہفتے تک نمبر ون رہی تھی۔

*****

بل گیٹس کا گھر پر تعیش اور دنیا کا مہنگا ترین مکان ہے۔ واشنگٹن جھیل کے مشرقی کنارے پر واقعی وہ مکان کسی محل کی طرح نظر آتا ہے۔ اس کی جائیداد 66 ہزار مربع فٹ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا سوئمنگ پول ساٹھ فٹ لمبا ہے۔ پیرا کی کے دوران موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس میں زیر آب موسیقی کا جدید ترین سسٹم نصب ہے۔ اس کے مکان کا ڈھائی ہزار مربع فٹ جمنازیم کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا ڈائننگ ہال ایک ہزار مربع فٹ پر محیط ہے۔ اس وقت اس کے مکان اور اطراف کی کل جائیداد کی قیمت ایک ارب تیرہ کروڑ ڈالر ہے وہ اس پر سالانہ دس لاکھ ڈالر ٹیکس ادا کرتا ہے۔

2001ء میں اخبار گارڈین نے جب سو بڑے اور ذی اثر اشخاص کی فہرست بنائی جن کا میڈیا میں طوطی بولتا ہے تو بل گیٹس کا اس فہرست میں دوسرا نمبر تھا۔

1984ء کے شمارے کے سرورق پر امریکا کے مشہور میگزین'' ٹائم'' نے اس کی تصویر شائع کی۔ اس کے علاوہ ساتھ اور مواقعوں پر بھی وہ سرورق کی زینت بن چکے ہیں۔

چیف ایگزیکٹو آفیسرز میگزین نے پچاس بڑے لوگوں کی فہرست میں اسے پہلا نمبر دیا۔ 2008ء میں شائع ہونے والی کولمبیا انسائیکلوپیڈیا کے چھٹے ایڈیشن کے مطابق بل گیٹس رحمدل اشخاص میں سے ایک ہے۔ وہ کبھی دنیا کا دولت مند ترین شخص تھا لیکن اب اپنی ساری آمدنی مفلس اور ناداروں میں تقسیم کر چکا ہے۔

بل گیٹس کے مخالفین کہتے ہیں کہ وہ نہ تو آئن سٹائین ہے اور نہ ہی ہنری فورڈ۔ کیونکہ اس نے کوئی چیز ایجاد نہیں کی ہے اس لیے وہ کوئی موجد نہیں اسے آئن سٹائین سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ وہ محض ایک ساحر ہے جس نے کمپیوٹر پروگرامز سے لوگوں کے ذہنوں کو مسخر کر چکا ہے اور کامیابی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ وہ ایک کاروباری شخص ہے جس میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

بل گیٹس کی کاروباری ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے اوائل عمری میں IBM کمپنی کو پبلک کمپیوٹر کا آپریٹنگ سسٹم فروخت کیا تھا لیکن اس کے حقوق آج تک اسی کے پاس ہیں۔ گویا IBM اب بھی اس کی محتاج ہے۔ جب بھی کوئی پبلک کمپیوٹر فروخت ہوتا ہے تو اس سے ہونے والے منافع میں بل گیٹس کا معقول حصہ ہوتا ہے۔

بل گیٹس مائکرو سافٹ سے مقابلہ کرنے والی نانوے کمپنیوں کی ایک برس کی پروڈکشن خرید سکتا ہے۔ مائکروسافٹ کا اثاثہ جات اس وقت 25 بلین ڈالر سے زائد ہے جس نے اسے فورڈ، جرنل موٹرز، بوئنگ طیارہ بنانے والی کمپنی اور ایسٹ مین کوڈک کمپنی کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کوکا کولا کمپنی کو اسٹاک مارکیٹ تک پہنچنے میں تیس برس کا عرصہ لگا تھا۔ میکڈونالڈ کو بھی امریکا سے باہر دوسرے ممالک میں اپنے ریسٹورنٹ کھولنے میں بھی تقریباً تیس سال لگے تھے جب کہ بل گیٹس نے یہ سب کچھ چھ سال سے بھی کم عرصے میں حاصل کر لیا۔

****

بل گیٹس کی دولت

بل گیٹس کی دولت بارے

بل گیٹس کی دولت بارے بہت سے افسانوی قصے مشہور ہیں۔ وہ کئی سال تک دنیا کے امیر ترین لوگوں میں پہلے نمبر پر رہے ہیں۔۔ بل گیٹس کے پاس مائیکروسافٹ کے سب سے زیادہ ستانوے کروڑ سے زائد شیئرز موجود ہیں۔ بل گیٹس کو پینتس ممالک میں سربراہ مملکت کا پروٹوکول ملتا ہے اور ایک اندازے کے مطابق بل گیٹس کی وجہ سے دنیا بھر کے ایک لاکھ اٹھائیس ہزار لوگ ارب پتی بن چکے ہیں۔

اس وقت دنیا میں ایک ہزار ایک سو پچیس کھرب پتی ہیں۔ ان میں چار سو پچانوے کا تعلق امریکا سے ہے جن میں ایک نام بل گیٹس کا ہے۔

بل گیٹس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی دولت میں ہر سیکنڈ بعد 250 ڈالر کا اضافہ ہو جاتا ہے اگر اس اضافے کو چوبیس گھنٹوں پر ضرب دیں تو یہ 21.6 ملین ڈالر بنتے ہیں اور اگر ان ڈالرز کو روپوں میں تقسیم کیا جائے تو یہ ایک ارب 72 کروڑ 80 لاکھ روپے بنتے ہیں۔ گویا بل گیٹس کی دولت میں ایک ارب 73 کروڑ روپے روزانہ اضافہ ہو رہا ہے۔

بل گیٹس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے ہاتھ سے ہزار ڈالر گر جائے تو اسے اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اسے ہزار ڈالر کا نوٹ اٹھانے میں چار سیکنڈ لگیں گے جبکہ ان تین چار سیکنڈ میں اس کی دولت میں ہزار ڈالر کا ویسے ہی اضافہ ہو چکا ہو گا

۔

امریکا اس وقت 7.3 ٹریلین ڈالر کا مقروض ہے۔ بل گیٹس اکیلا دس سال میں امریکا کا سارا قرضہ اتار سکتا ہے۔

بل گیٹس اگر پوری دنیا کے لوگوں میں 15۔15 ڈالر تقسیم کرے تو بھی اس کے پاس پانچ ملین ڈالر بچ جائیں گے۔ بل گیٹس کی دولت کو اگر ایک ایک ڈالر میں تقسیم کر دیا جائے تو اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے 713 بوئنگ طیاروں کی ضرورت پڑے گی۔ اگر اس کے نوٹوں کو لمبائی میں بچھا دیا جائے تو یہ زمین سے چاند تک کے فاصلے کے چودہ گنا زیادہ ہوں گے۔ بل گیٹس اگر اپنی دولت 35 سال تک خرچ کرتا رہے تو اسے روزانہ 70 لاکھ ڈالر خرچ کرنا پڑیں گے تب جا کر اس کی دولت ختم ہو گی۔

بل گیٹس کی دولت بارے یہ باتیں افسانوی ہیں یا حقیقت اس بات کو یہی رہنے دیتے ہیں بل گیٹس کا ایک قول پڑھیے جو ترقی کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

بل گیٹس نے کہا تھا۔

اگر آپ غریب پیدا ہوئے ہیں تو اس میں آپ کا قصور نہیں

لیکن اگر آپ غربت کی حالت میں مرتے ہیں تو اس میں صرف اور صرف آپ کا قصور ہے

آسٹریلیا آسٹریلیا ہے

عبداللہ

پندرہ سال پہلے 1996 کے کرکٹ عالمی کپ کے فائنل میں جب آسٹریلیا کو سری لنکا سے شکست ھوئی اور لاہور میں محترمہ بے نظیر نے جب رانا ٹنگا کو ورلڈ کپ ٹرافی تھمائی تو آسٹریلوی ٹیم غالباً یہی سوچ رھی تھی کہ اس دفعہ تو یہ اعزاز آخری لمحات میں نکل گیا لیکن آئندہ نہیں۔

بس پھر کیا تھا آسٹریلیا کی حکمرانی کا دور شروع ھو گیا جو کہ شروع تو 1996 سے ھوتا ھے لیکن اس کو عروج 1999 کے عالمی کپ کے بعد ملتا ھے۔ جس کے بعد تو آسٹریلیا نے جیسے پیچھے مڑ کر دیکھنا ھی چھوڑ دیا اور کافی عرصے تک بلکہ اب بھی دنیا کی نمبر ایک ٹیم ھے۔ ان 15 سالوں میں آسٹریلیا نے 3 ورلڈ کپ ایک چیمپئنز ٹرافی اور بیسیوں سیریز جیتی ھیں۔ انہی سالوں میں کرکٹ آسٹریلیا کو چند ایسے نام ملے کہ شائد ھی ایسے کھلاڑی اب دیکھنے کو ملیں۔ ان میں مائیکل بیون، جسٹن لینگر، میتھیو ہیڈن، ڈیمین مارٹن، ایڈم گلکرسٹ، شین وارن اور گلین میگرا کے ساتھ واہ برادارن اور مائیکل کلارک ور کی پونٹنگ کا نام بھی شامل ھے۔

ان 15 سالوں کی طویل حکمرانی کے بعد میں آسٹریلیا کو کرکٹ کا "بے تاج بادشاہ" نہ کہوں تو یقیناً یہ کرکٹ اور کینگروز کیساتھ زیادتی ھوگی۔

15 سالہ اس حکمرانی میں ایک دو دفعہ ایسا وقت بھی آیا جب ناقدین اور شائقین کرکٹ نے کہا کہ اب آسٹریلوی ٹیم کی حکومت ختم ھونے کو ھے۔ مثلاً دو برس قبل جب گوروں نے کینگروز کو اپنی سر زمیں پر "ایشیز" میں شکست سے دوچار کیا تو ناقدین کے مُنہ کچھ زیادہ ھی کھل گئے۔ کیونکہ اس سے قبل آسٹریلوی ٹیم ورلڈ کپ (ٹونٹی ٹونٹی) میں سری لنکا اور ویسٹ انڈیز سے شکست کھا کر پہلے ہی راؤنڈ کے بعد باہر ھو چکی تھی لہذا چاروں طرف سے پونٹنگ اور آسٹریلیا پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔

لیکن ٹیم آسٹریلیا ان باتوں کی پرواہ کئے بغیر انگلینڈ کے خلاف میدان میں اتری اور سات ایک روزہ میچز کی سیریز چھ۔ ایک سے جیت لی۔ اسکے بعد آسٹریلیا نے چیمپئنز ٹرافی میں بھی ناقابل شکست رھتے ھوئے جیتی اور اپنی اوپر اٹھنے والی انگلیوں کو بنا کچھ کہے ھی نیچے کر دیا۔

اب 2010 کی ایشیز میں جب دوبارہ گوروں نے کینگروز کی سرزمین پر ھی ان کو تین۔ ایک کے واضح مارجن سے شکست دے دی تو ناقدین نے پھر اپنا مُنہ کھول لیا۔ لیکن آسٹریلیا نے سات ایک روزہ میچز کی سیریز میں شاندار فتح حاصل کرتے ھوئے یہ باور کرا دیا ھے کہ ابھی ہماری حکمرانی ختم نہیں ھوئی۔ ہاں ہمارے چند اہم کھلاڑیوں کے ایک ساتھ ٹیم سے رخصت ھونے کی وجہ سے ہماری پرفارمنس میں پہلے جیسا تسلسل نہیں رھا، لیکن ابھی بھی ہمارے ینگ کھلاڑیوں میں اتنا دم خم باقی ھے کہ وہ ان چیلنجز کا مقابلہ کر سکیں اور ورلڈ کپ جیسے اہم ایونٹ میں اعلیٰ کارگردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔

اگر میں اب مندرجہ بالا تحریر اور حقائق کو پڑھ کر یہ کہوں کہ "آسٹریلیا، آسٹریلیا ہے" تو بلاشبہ غلط نہ ھوگا۔

غالباً جب تک یہ آرٹیکل ون اردو کے کسی شمارے میں شامل ھوگا، ورلڈ کپ کا آغاز ھونے ہی والا ھوگا۔ کچھ پتہ نہیں کہ اعزاز اس دفعہ بھی کینگروز ھی لے اڑیں۔ باقی تو مقابلے اور فائنل دیکھنے کے بعد ھی کچھ کہا جا سکتا ھے۔

ورلڈ کپ کے فائنل میچ میں مین آف دی میچ کا اعزاز پانے والے پلیئرز درج ذیل ہیں۔

پہلے ورلڈ کپ (1975) میں کلائیو لائیڈ مین آف دی میچ رہے۔ انہوں نے کپتان کے شایان شان اننگز کھیلتے ہوئے شاندار سنچری سکور کی۔

دوسرے ورلڈ کپ (1979) کے فائنل میں ویوین رچرڈز نے رنز کی برسات کی اور سنچری بنائی، جس پہ ان کو مین آف دی میچ کا حقدار قرار دیا گیا۔

تیسرے ورلڈ کپ (1983) میں مہندر امرناتھ مین آف دی فائنل میچ رہے۔ انہوں نے شاندار آل راؤنڈ کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ تین وکٹس لی تھیں اور شاید چالیس کے قریب سکور بھی کیا تھا۔

چوتھے ورلڈ کپ (1987) میں ڈیوڈ بون نے فائنل میچ میں نصف سنچری سکور کی تھی، جس کی بدولت مین آف دی میچ کا اعزاز ان کے حصے میں آیا۔

پانچویں ورلڈ کپ (1992) میں فائنل میچ میں وسیم اکرم نے 18 بالز پہ شاندار 33 رنز بنائے اور اس کے بعد باؤلنگ میں بھی تین اہم وکٹس لے کر پاکستان کی جیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کارکردگی پہ وسیم اکرم کو مین آف دی فائنل میچ کا اعزاز ملا۔

چھٹے ورلڈ کپ (1996) کا فائنل میچ ارونڈاڈی سلوا کے نام رہا۔ ڈی سلوا نے سب سے بہترین بیٹنگ، سب سے بہترین باؤلنگ اور سب سے زیادہ کیچز لئے۔ بیٹنگ میں تو ڈی سلوا نے ناٹ آؤٹ سنچری سکور کی۔ باؤلنگ میں تین وکٹس لیں (اور سب سے بیسٹ باؤلنگ گلرز حاصل کئے) اور فیلڈنگ میں بھی دو کیچز لئے۔ اس پہ مین آف دی فائنل ارونڈاڈی سلوا کے علاوہ کوئی اور ہونے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ساتویں ورلڈ کپ (1999) کے فائنل میں شین وارن نے چار وکٹس لے کر پاکستانی بیٹنگ کی کمر توڑ دی۔ اس پہ شین وارن کو مین آف دی میچ کا اعزاز دیا گیا۔

آٹھویں ورلڈ کپ (2003) کے فائنل میں رکی پونٹنگ نے رنز کا بھنگڑا ڈالا اور چھکوں کی ایسی برسات کی کہ بھارتی باؤلرز آج بھی اس کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہوں گے۔ اس پہ رکی پونٹنگ کو مین آف دی فائنل میچ کا اعزاز دیا گیا۔

نویں ورلڈ کپ (2007) کے فائنل میں ایڈم گلکرسٹ نے سری لنکن باؤلنگ کا بھرکس نکالا۔ پورے ٹورنامنٹ کے دوران ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے وکٹ کیپر بیٹسمین نے فائنل میں ساری کسر نکال دی اور 149 رنز کی شاندار اننگز کھیلی۔ اس ایک اننگز نے میچ کا تقریباً" فیصلہ کر ہی دیا تھا۔ اس پہ گلکرسٹ کو مین آف دی میچ کا اعزاز دیا گیا۔

. یاز غل *.*

☆ماہِ فروری کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کے تبصرے کے منتظر ہیں۔

☆اپنی تحاریر اور تبصرے ون اردو میگزین ٹیم کو پرائویٹ میسج کے ذریعے ارسال کیجیے۔

☆اگر آپ ون اردو فورم کے میمبر نہیں ہیں تو ون اردو میگزین ٹیم سے رابطہ کرنے کے لیے اس ای میل ایڈریس پر ای میل کر سکتے ہیں:

OneUrdumag@yahoo.com

☆---☆---☆